○ ۱۸۱۶ء

بے گریہ کمالِ ترجبینی ہے مجھے — در بزمِ وفا خجل نشینی ہے مجھے
محرومِ صدا رہا بغیر از یک تار — ابریشمِ ساز، موے چینی ہے مجھے

گر جوہرِ امتیاز ہوتا ہم میں — رسوا کرتے نہ آپ کو عالم میں
ہیں نامِ نگیں، کہیں گہِ نقبِ شعور — یہ چور پڑا ہے خانۂ خاتم میں

ہے خلقِ حسد قماش لڑنے کے لیے — وحشت کدۂ تلاش لڑنے کے لیے
یعنی[2]، ہر بار صورتِ کاغذِ باد — [1] ملتے ہیں یہ بدمعاش لڑنے کے لیے

گلخن، شررِ اہتمام بستر ہے آج — یعنی تبِ عشق شعلہ پرور ہے آج
ہوں وردِ ہلاکِ نامہ بر سے بیمار — قارورہ مرا خونِ کبوتر ہے آج

۱۔ رخ = نقش

۲۔ 〃 = ے جوں کاغذِ باد کو ہوا وجہِ ہوس

۱۸۱۷ء تا ۱۸۲۱ء

حاشیہ

نسخۂ بھوپال

(بخطِ غالبؔ)

۱۸۱۶ء

نسخۂ بھوپال

(مشمولۂ نسخۂ حمیدیہ)

۱۸۲۱ء

○ ... بعد از ۱۸۱۶ء (حاشیہ نخ)

غنچۂ ناشگفتہ کو دُور سے مت دکھا کہ یوں م بوسے کو پوچھتا ہوں میں، مُنہ سے مجھے بتا کہ یوں
پُرسشِ طرزِ دلبری کیجیے کیا؟ کہ بِن کہے م اُس کے ہر ایک اشارے سے نکلے ہے یہ ادا کہ یوں
رات کے وقت مے پیے، ساتھ رقیب کو لیے م آئے وہ یاں، خدا کرے، پر نہ کرے خدا کہ یوں
+غیر سے رات کیا بنی؟ یہ جو کہا، تو دیکھیے م سامنے آن بیٹھنا اور یہ دیکھنا کہ یوں
بزم میں اُس کے روبرو، کیوں نہ خموش بیٹھیے؟ م اُسکی تو خامشی میں بھی ہے یہی مُدّعا کہ یوں
میں نے کہا کہ "بزمِ ناز چاہیے غیر سے تہی" م سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں
+مجھ سے کہا جو یار نے "جاتے ہیں ہوش کس طرح؟" م دیکھ کے میری بیخودی، چلنے لگی ہوا کہ یوں
+کب مجھے کوے یار میں رہنے کی وضع یاد تھی؟ م آئنہ دار بن گئی حیرتِ نقشِ پا کہ یوں
+گر ترے دل میں ہو خیال، وصل میں شوق کا زوال م موجِ محیطِ آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں
جو یہ کہے کہ "ریختہ کیونکے ہو رشکِ فارسی؟" م گفتۂ غالب[1] ایکبار پڑھ کے اُسے سُنا کہ یوں

وہ فراق اور وہ وصال کہاں؟ م وہ شب و روز و ماہ[2] و سال کہاں؟
فرصتِ کاروبارِ شوق کِسے؟ م ذوقِ نظّارۂ جمال کہاں؟
دل تو دل، وہ دماغ بھی نہ رہا م شورِ سودائے خطّ و خال کہاں؟

۱۔ نخ ـــــ شعر اسدؔ کے ایک دو پڑھ کے اُسے سُنا کہ یوں
۲۔ ״ = اور وہ سال ...
+ یہ اشعار پہلے پہل حاشیہ ق میں درج ہوئے

○ ... بعد از ۱۸۱۶ء (حاشیہ نخ)

تھی[1] وہ اک شخص کے تصوّر سے م اب وہ رعنائیِ خیال کہاں؟
ایسا آساں نہیں لہو رونا م دل میں طاقت، جگر میں حال کہاں؟
ہم سے چھوٹا قمارخانۂ عشق م واں جو جاویں، گرہ میں مال کہاں؟
فلکِ سِفلہ بے مُحابا ہے م اس ستمگر کو انفعال کہاں؟
بوسے میں وہ مضایقہ نہ کرے م پر مجھے طاقتِ سوال کہاں؟
فکرِ دنیا میں سر کھپاتا ہوں م میں کہاں اور یہ وبال کہاں؟
مضمحل ہو گئے قُویٰ، غالبؔ م وہ عناصر میں اعتدال کہاں؟

وارستہ اس سے ہیں کہ مُحبّت ہی کیوں نہ ہو م کیجے ہمارے ساتھ، عداوت ہی کیوں نہ ہو
چھوڑا نہ مجھ میں ضعف نے رنگ اِختلاط کا م ہے دل پہ بار، نقشِ محبت ہی کیوں نہ ہو
ہے مجھ کو تجھ سے تذکرۂ غیر کا گلہ م ہر چند بر سبیلِ شکایت ہی کیوں نہ ہو
"پیدا ہوئی ہے" کہتے ہیں "ہر درد کی دوا" م یوں ہو، تو چارۂ غمِ اُلفت ہی کیوں نہ ہو
ڈالا نہ بیکسی نے کسی[2] سے معاملہ م اپنے سے کھینچتا ہوں، خجالت ہی کیوں نہ ہو
ہے آدمی، بجاے خود اک محشرِ خیال م ہم انجمن سمجھتے ہیں، خلوت ہی کیوں نہ ہو
ہنگامۂ زبونیِ ہمت ہے اِنفعال م حاصل نہ کیجے دہر سے، عبرت ہی کیوں نہ ہو

۱۔ نخ ـــــ تھی وہ خوباں ہی کے تصوّر سے ۲۔ نخ = کسو
٥ یہ شعر پہلی بار متن ق میں درج ہوا

○ ... بعد از ۱۸۱۶ء (حاشیہ نخ)

وارستگی بہانۂ بیگانگی[1] نہیں م اپنے سے کر، نہ غیر سے، وحشت ہی کیوں نہ ہو
مٹتا ہے فوتِ فرصتِ ہستی کا غم کوئی م عمرِ عزیز[2]، صرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو

اُس فتنہ خو کے در سے اب اُٹھتے نہیں اسدؔ
اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو م

سمجھاؤ اُسے، یہ وضع چھوڑے جو چاہے کرے، پہ دل نہ توڑے[3]
تقریر کا اس کی حال مت پوچھ معنی ہیں بہت، تو لفظ تھوڑے
نذرِ مژہ کر دل و جگر کو چیرے ہی سے جائیں گے یہ پھوڑے
عاشق کو یہ چاہیے کہ ہرگز اندوہ سے [ڈر کے] مُنھ نہ موڑے
آجا لبِ بام، کوئی کب تک دیوار سے اپنے سر کو پھوڑے
جاتے ہیں رقیب کو خط اُس کے کاغذ کے دوڑتے ہیں گھوڑے
غم خوار کو ہے قسم کہ زنہار ق غالبؔ کو نہ تشنہ کام چھوڑے
حسرت زدۂ طرب ~~ہے یہ~~ شخص دم جب کہ بہ وقتِ نزع توڑے
پانی نہ چوائے اس کے منھ میں گُل مے میں بھگو بھگو نچوڑے

۱۔ نخ = سنگین دلی ۲۔ نخ = ہر چند عمر
۳۔ = یہ غزل نخ کے حاشیے پر کسی دوسرے کے قلم سے، درج ہے اس لیے اسے ۱۸۱۶ء کے بعد کے کلام میں رکھا گیا۔ مگر غزل کا اسلوب غالبؔ کے اسلوب سے میل نہیں کھاتا۔ اگر یہ غالبؔ ہی کا کلام ہے تو ابتدائی مشق کا نمونہ سمجھنا چاہیے کیونکہ بیس سال کی عمر تک غالبؔ کے فکر و فن کی توانائی ظاہر ہو چکی تھی۔

○ ... بعد از ۱۸۱۶ء (حاشیہ نخ)

کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہان ہے م جس میں کہ ایک بیضۂ مور، آسمان ہے
ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے م پرتو سے آفتاب کے، ذرّے میں جان ہے
حالِ[5] آں کہ ہے یہ سیلیِ خارا سے لالہ رنگ م غافل کو میرے شیشے پہ مے کا گمان ہے
کی اس نے گرم، سینۂ اہلِ ہوس میں جا م آوے نہ کیوں پسند، کہ ٹھنڈا مکان ہے
کیا خوب! تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا؟ م بس چپ رہو، ہمارے بھی مُنھ میں زبان ہے
بیٹھا ہے جو کہ سایۂ دیوارِ یار میں م فرماں روائے کشورِ ہندوستان ہے
ہستی[5] کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا! م کس سے کہوں کہ "داغ"، جگر کا نشان ہے
ہے، بارے، اعتمادِ وفاداری اس قدر م غالبؔ[1] ہم اس میں خوش ہیں کہ نامہرباں ہے

دِلّی[2] کے رہنے والو، اسدؔ کو ستاؤ مت
بیچارہ، چند روز کا یاں[3] میہمان ہے

درد سے میرے، ہے تجھ کو بیقراری ہائے ہائے! م کیا ہوئی، ظالم، تری غفلت شعاری ہائے ہائے!
تیرے دل میں گر نہ تھا آشوبِ غم کا حوصلہ م تو نے پھر کیوں کی تھی میری غمگساری ہائے ہائے!
کیوں مری غم خوارگی کا تجھ کو آیا تھا خیال؟ م دشمنی اپنی تھی، میری دوست داری ہائے ہائے!

۱۔ نخ = ہم بھی اسی
۲۔ " = دہلی
۳۔ " = یہ
۵ یہ اشعار پہلی بار متن قا میں درج ہوئے

○ ...بعد از ۱۸۱۶ء (حاشیہ نخ)

عمر بھر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا؟ م عمر کو بھی تو نہیں ہے پایداری ہائے ہائے!
زہر لگتی ہے مجھے آب و ہوائے زندگی م یعنی، تجھ سے تھی اسے ناسازگاری ہائے ہائے!
گل فشانی ہائے نازِ جلوہ کو کیا ہو گیا؟ م خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ہائے ہائے!
شرمِ رسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں م ختم ہے الفت کی، تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے!
خاک میں ناموسِ پیمانِ محبت مل گئی م اُٹھ گئی دنیا سے راہ و رسمِ یاری ہائے ہائے!
ہاتھ ہی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا! م دل پہ اک لگنے نہ پایا، زخمِ کاری ہائے ہائے!
کس طرح کاٹے کوئی شب ہائے تارِ برشکال؟ م ہے نظر خو کردۂ اختر شماری ہائے ہائے!
گوش مہجورِ پیام و چشم محرومِ جمال م ایک دل تس پر یہ نا اُمیدواری ہائے ہائے!
عشق نے پکڑا نہ تھا، غالبؔ ابھی وحشت کا رنگ م رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوقِ خواری ہائے ہائے!

گر مصیبت تھی، تو غربت میں اُٹھا لیتا، اسدؔ
میری دِلّی[1] ہی میں ہونی تھی یہ خواری ہائے ہائے!

عشق مجھ کو نہیں، وحشت ہی سہی م میری وحشت، تری شہرت ہی سہی
قطع کیجے نہ تعلّق ہم سے م کچھ نہیں ہے، تو عداوت ہی سہی
میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی؟ م اے وہ مجلس نہیں، خلوت ہی سہی

۱۔ نخ = دہلی
▭ یہ شعر م میں موجود ہے

○ ...بعد از ۱۸۱۶ء (حاشیہ نخ)

ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے م غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی
اپنی ہستی ہی سے ہو، جو کچھ ہو م آگہی گر نہیں، غفلت ہی سہی
عمر، ہر چند کہ ہے برق خرام م دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی
ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں م نہ سہی عشق، مصیبت ہی سہی
کچھ تو دے، اے فلکِ ناانصاف م آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی
ہم بھی تسلیم کی خو، ڈالیں گے م بے نیازی، تری عادت ہی سہی
یار[1] سے چھیڑ چلی جائے، اسدؔ م گر نہیں وصل، تو حسرت ہی سہی

چاہیے اچھوں[2] کو، جتنا چاہیے م یہ اگر چاہیں، تو پھر کیا چاہیے
صحبتِ رنداں سے واجب ہے حذر م جائے مے اپنے کو کھینچا چاہیے
دل تو ہوا اچھا، نہیں ہے گر دماغ م کچھ تو اسبابِ تمنّا چاہیے
چاہنے کو تیرے کیا سمجھا تھا دل؟ م بارے، اب اس سے بھی سمجھا چاہیے
چاک مت کر جیب بے ایّامِ گل م کچھ اُدھر کا بھی اشارا چاہیے
دوستی* کا پردہ ہے، بیگانگی م منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیے

۱۔ نخ = ے چھیڑ خوباں سے ...۔
۲۔ ” = خوباں
* یہ شعر پہلی بار آخرِ ق میں اضافہ ہوا

○ ... بعد از ۱۸۱۶ء (حاشیہ نخ)

اپنی، رسوائی میں کیا چلتی ہے سعی ؏ یار ہی ہنگامہ آرا چاہیے
دشمنی* نے میری کھویا غیر کو ؏ کس قدر دشمن ہے؟ دیکھا چاہیے
منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید ؏ ناامیدی اُس کی دیکھا چاہیے
چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسدؔ ؏ [قطعہ] آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے
غافل[۱] ان مہ طلعتوں کے واسطے ؏ چاہنے والا بھی اچھا چاہیے

پھر کچھ اک، دل کو بے قراری ہے ؏ سینہ، جویائے زخمِ کاری ہے
پھر جگر کھودنے لگا ناخن ؏ آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے
قبلۂ مقصدِ نگاہِ نیاز ؏ پھر وہی پردۂ عماری ہے
چشم، دلّالِ جنسِ رسوائی ؏ دل، خریدارِ ذوقِ خواری ہے
وہی صد رنگ نالہ فرسائی ؏ وہی صد گونہ اشکباری ہے
دل، ہوائے خرامِ ناز سے پھر ؏ محشرستانِ بے قراری ہے
جلوہ، پھر عرضِ ناز کرتا ہے ؏ روزِ بازارِ جانسپاری ہے
پھر اُسی بے وفا پہ مرتے ہیں ؏ پھر وہی زندگی ہماری ہے
پھر کھُلا ہے درِ عدالتِ ناز ؏ [قطعہ] گرم، بازارِ فوجداری ہے

۱۔ نخ = یعنی
* یہ شعر پہلی بار آخرِق میں اضافہ ہُوا

○ ... بعد از ۱۸۱۶ء (حاشیہ نخ)

ہو رہا ہے جہان میں اندھیر ؏ زلف کی پھر سرشتہ داری ہے
پھر دیا پارۂ جگر نے سوال ؏ ایک فریاد و آہ و زاری ہے
پھر[۱] ہوئے ہیں گواہِ عشق طلب ؏ اشک باری کا حُکم جاری ہے
دل و مژگاں کا جو مُقدّمہ تھا ؏ آج پھر اُس کی روبکاری ہے
بےخودی بے سبب نہیں غالبؔ ؏ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

مدّت[۲] ہوئی ہے، یار کو مہماں کیے ہوئے ؏ جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے
کرتا ہوں جمع، پھر جگرِ لخت لخت کو ؏ عرصہ ہوا ہے، دعوتِ مژگاں کیے ہوئے
پھر وضعِ احتیاط سے رکنے لگا ہے دم ؏ برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کیے ہوئے
پھر گرمِ نالہ ہائے شرر بار ہے نفَس ؏ مدّت ہوئی ہے سیرِ چراغاں کیے ہوئے
پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق ؏ سامانِ صد ہزار نمکداں کیے ہوئے
پھر بھر رہا ہوں خامۂ مژگاں بخونِ دل ؏ سازِ چمن طرازیِ داماں کیے ہوئے
باہمد گر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب ؏ نظّارہ و خیال کا ساماں کیے ہوئے
دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے ؏ پندار کا صنم کدہ ویراں کیے ہوئے

۱۔ نخ = ہو رہے ہیں .... بے قراری کا ....؟
۲۔ نخ = نخ میں اس غزل کے صرف ۱۳ شعر حاشیے میں درج ہیں۔ مطلع اور پہلے دو شعر پہلی بار آخرِق میں اضافہ ہوئے اور چوتھا شعر پہلی بار متن ق میں درج ہُوا

○ ... بعد از ۱۸۱۶ء (حاشیہ نخ)

پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب م عرضِ متاعِ عقل و دل و جاں کیے ہوئے
دوڑے ہے پھر، ہر ایک گل و لالہ پر خیال م صد گلستاں نگاہ کا ساماں کیے ہوئے
پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا م جاں نذرِ دلفریبیِ عُنواں کیے ہوئے
مانگے ہے پھر، کسی کو لبِ بام پر، ہوس م زُلفِ سیاہ رُخ پہ پریشاں کیے ہوئے
چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو م سُرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کیے ہوئے
اِک نوبہارِ ناز کو تاکے ہے، پھر نگاہ م چہرہ، فروغِ مے سے گلستاں کیے ہوئے
پھر، جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں م سر زیرِ بارِ منّتِ درباں کیے ہوئے
جی ڈھونڈھتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن م بیٹھے رہیں تصوّرِ جاناں کیے ہوئے
غالبؔ ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے م بیٹھے ہیں ہم تہیّۂ طوفاں کیے ہوئے

بے اعتدالیوں سے سُبک سب میں ہم ہوئے م جتنے زیادہ ہو گئے، اُتنے ہی کم ہوئے
پنہاں تھا، دام، سخت قریب آشیاں[1] کے م اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے
ہستی ہماری، اپنی فنا[2] پر دلیل ہے م یاں تک مٹے کہ آپ ہم اپنی قسم ہوئے
سختی کشانِ عشق کی، پوچھے ہے کیا خبر م وہ لوگ رفتہ رفتہ سراپا الم ہوئے
تیری وفا سے کیا ہو تلافی ؟ کہ دہر میں م تیرے سوا بھی، ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

۱۔ نخ = آشیانہ
۲۔ " = کی

○ ... بعد از ۱۸۱۶ء (حاشیہ نخ)

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں م ہر چند اُس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے
اللہ رے! تیری تندیِ خو، جس کے بیم[1] سے م اجزائے نالہ، دل میں مرے رزقِ ہم ہوئے
اہلِ ہوس کی فتح ہے، ترکِ نبردِ عشق م جو پاؤں اُٹھ گئے، وہی اُن کے عَلَم ہوئے
نالے[5]، عدم میں، چند ہمارے سپرد تھے م جو واں نہ کھنچ سکے، سو وہ یاں آ کے دم ہوئے
چھوڑی، اسدؔ، نہ ہم نے گدائی میں دل لگی م سائل ہوئے، تو عاشقِ اہلِ کرم ہوئے

جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی م لکھ دیجیو[2]، یارب، اُسے قسمت میں عدو کی
اچھا ہے سرِ انگشتِ حنائی کا تصوّر م دل میں نظر آتی تو ہے اک بوند لہو کی
کیوں ڈرتے ہو عشّاق کی بے حوصلگی سے؟ م یاں[3] تو کوئی سنتا نہیں فریاد کسو کی
اے بے خبراں، میرے لبِ زخمِ جگر پر بخیہ جسے کہتے ہو شکایت ہے رفو کی
گو زندگیِ زاہدِ بے چارہ عبث ہے اتنا ہے[4] کہ رہتی تو ہے تدبیر وضو کی
صد حیف! وہ ناکام کہ اک عمر سے غالبؔ م حسرت میں رہے ایک بتِ عربدہ جو کی
دشنے نے کبھی منہ نہ لگایا ہو جگر کو م خنجر نے کبھی بات نہ پوچھی ہو گلو کی

۱۔ نخ = وہم
۲۔ " = یارب اسے لکھ دیجیو ....
۳۔ " = صاحب
۴۔ " = اتنا تو ہے
٥ یہ شعر پہلی بار متن قا میں درج ہوا

○ ... بعد از ۱۸۱۶ء (حاشیہ نخ)

رونے سے اور عشق میں بے باک ہو گئے م دھوئے گئے ہم اتنے کہ بس پاک ہو گئے
صرفِ بہائے مے ہوئے، آلاتِ میکشی م تھے یہ ہی دو حساب، سو یوں پاک ہو گئے
رسوائے دہر گو ہوئے آوارگی سے، تم م بارے، طبیعتوں کے تو چالاک ہو گئے
کہتا ہے کون نالۂ بلبل کو بے اثر؟ م پردے میں گل کے، لاکھ جگر چاک ہو گئے
پوچھے ہے کیا وجود و عدم اہلِ شوق کا؟ م آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے
کرنے گئے تھے اُس سے تغافل کا، ہم گلہ م کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے
پوچھے ہے کیا معاشِ جگر تفتگانِ عشق جوں شمع، آپ اپنی وہ خوراک ہو گئے
اس رنگ سے اُٹھائی کل اُس نے اسدؔ کی نعش[۲] م دشمن بھی جس کو دیکھ کے غمناک ہو گئے

قصائد

○ ... ۱۸۲۱ء

(۱)[۱]

سازِ[۳] یک ذرہ نہیں فیضِ چمن سے، بے کار م سایۂ لالۂ بے داغ، سُویدائے بہار
مستیِ بادِ صبا سے ہے، بہ عرضِ سبزہ م ریزۂ شیشۂ مے، جوہرِ تیغِ کُہسار

۱۔ نخ = میں، ہم
۲۔ نخ = لاش
= اس غزل کا پانچواں شعر م میں موجود ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ساتویں شعر کو جو ق کے متن میں ہے، منسوخ کر کے رکھا گیا ہو۔ تاہم میری رائے میں دونوں اشعار کی جُداگانہ حیثیت ہے، اس لیے دونوں ہی برقرار رکھے گئے

۱۔ ق = عنوان ہے "قصیدۂ حیدری بہ تمہیدِ بہارِ مغفرت"

○ ... ۱۸۲۱ء

سنگ، یہ کارگہِ ربطِ نزاکت ہے، کہ ہے خندۂ بے خودیِ کبک، بدندانِ شرار
سبز ہے، جامِ زُمرّد کی طرح، داغِ پلنگ م تازہ ہے ریشۂ نارنج صفت، روئے شرار
کشتۂ افعیِ زلفِ سیہ شیریں کو بے ستوں سبزے سے، ہے سنگِ زُمرّد کا مزار
حسرتِ جلوۂ ساقی ہے کہ ہر پارۂ ابر سینۂ بے تابی سے، ملتا ہے بہ تیغِ کہسار
دشمنِ حسرتِ عاشق ہے، رگِ ابرِ سیاہ جس نے برباد کیا ریشۂ چندیں شبِ تار
مستیِ ابر سے گلچینِ طرب ہے حسرت م کہ اس آغوش میں ممکن ہے دو عالم کا فشار
کوہ و صحرا ہمہ، معموریِ شوقِ بلبل م راہِ خوابیدہ ہوئی خندۂ گل سے بیدار
چشم بر چشم چھنے ہے بہ تماشا، مجنوں ہر دو سو خانۂ زنجیر، نگہ کا بازار
خانۂ تنگ، ہجومِ دو جہاں کیفیت جامِ جمشید ہے یاں قالبِ خشتِ دیوار
سونپے ہے فیضِ ہوا صورتِ مژگانِ یتیم م سرنوشتِ دو جہاں ابر، بیک سطرِ غبار
کفِ ہر خاک بگردوں شدہ، قمری پرواز م دامِ ہر کاغذِ آتش زدہ، طاؤس شکار
سنبل و دامِ کمیں خانۂ خوابِ صیّاد نرگس و جامِ سیہ مستیِ چشمِ بیدار
طرّہ ہا، بس کہ، گرفتارِ صبا ہیں، شانہ زانوئے آئنہ پر مارے ہے دستِ بے کار
بس کہ یک رنگ ہوں دل کرتی ہے ایجادِ نسیم لالے کے داغ سے، جوں نقطہ و خطِ سنبل زار
اے خوشا! فیضِ ہوائے چمن نشو و نما بادہ پُر زور، و نفس مست، و مسیحا بیمار
کاٹ کر پھینکیے ناخن، تو بہ اندازِ ہلال م قوتِ نامیہ اُس کو بھی نہ چھوڑے بیکار
ہمّت و نشو و نما میں یہ بلندی ہے کہ سرو پرِ قمری سے کرے صیقلِ تیغِ کُہسار

○ ... ۱۸۲۱ء

ہر کفِ خاک، جگر تشنۂ صد رنگ ظہور — غنچے کے میکدے میں مستِ تامّل، ہے بہار
کس قدر عرض کروں ساغرِ شبنم، یارب؟ — موجۂ سبزۂ نوخیز، ہے لبریزِ خمار
غنچۂ لالہ سیہ مستِ جوانی ہے ہنوز — شبنمِ صبح، ہوئی رعشۂ اعضاے بہار
جوشِ بیدادِ تپش سے ہوئی عریاں آخر — شاخِ گلبن پہ صبا، چھوڑکے پیراہنِ خار
سازِ عریانیِ کیفیتِ دل ہے، لیکن — یہ مُے تند، نہیں موجِ خرامِ اظہار
موجِ مے پر ہے، براتِ نگرانیِ اُمید — گلِ نرگس سے کفِ جام پہ ہے چشمِ بہار
گلشن و میکدہ، سیلابیِ یک موجِ خیال — نشہ و جلوۂ گل، برسرِ ہم فتنہ غبار
میکدے میں ہو، اگر، آرزوے گل چینی م — بھول جا یک قدحِ بادہ بہ طاقِ گلزار
موجِ گل ڈھونڈھ بہ خلوت کدۂ غنچۂ باغ م — گم کرے، گوشۂ میخانہ میں گر تو، دستار
پشتِ لب، تہمتِ خط کھینچے ہے بے جا یعنی — سبز ہے موجِ تبسّم بہ ہواے گفتار
کھینچے گر مانیِ اندیشہ چمن کی تصویر م — سبز مثلِ خطِ نوخیز، ہو خطِّ پرکار
جاے حیرت ہے کہ گلبازیِ اندیشۂ شوق — اس زمیں میں نہ کرے سبز قلم کی رفتار

مطلعِ ثانی

لعل سی، کی ہے[1] پئے زمزمۂ مدحتِ شاہ م — طوطیِ سبزۂ کہسار نے پیدا منقار

۱۔ ق = مطلعِ ثانی کی شکل اصلاً یوں تھی ؎
لعل سی کی ہے بہ مدحِ چمن آراے بہار

○ ... ۱۸۲۱ء

کسوتِ تاک میں ہے نشّۂ ایجادِ ازل — سُبحۂ عرضِ دوعالم، بکفِ آبلہ دار
بہ نظرگاہِ گلستانِ خیالِ ساقی — بیخودی، دامِ رگِ گل سے ہے پیمانہ شکار
بہ ہواے چمنِ جلوہ، ہے طاؤس پرست — باندھے ہے پیرِ فلک موجِ شفق سے زنّار
یک چمن جلوۂ یوسف ہے بچشمِ یعقوب — لالہ ہا داغ برافگندہ، و گل ہا بے خار
بیضۂ قمری کے آئینے میں پنہاں صیقل — سروِ بیدل سے عیاں، عکسِ خیالِ قدِ یار
عکسِ موجِ گُل و سرشاریِ اندازِ حباب — نگہِ آئنہ، کیفیتِ دل سے دوچار
کس قدر سازِ دوعالم کو ملی جرأتِ ناز — کہ ہوا، ساغرِ بے حوصلۂ دل، سرشار
ورنہ وہ ناز ہے، جس گلشنِ بیداد سے تھا — طورِ مشعل بکف از جلوۂ تنزیہِ بہار
سایۂ تیغ کو دیکھ اس کے، بہ ذوقِ یک زخم — سینۂ سنگ پہ کھینچے ہے الف، بالِ شرار
بت کدہ، بہرِ پرستش گریِ قبلۂ ناز — باندھے زنّارِ رگِ سنگ، میانِ کہسار
سُبحہ گرداں ہے اسی کی کفِ امید کا، ابر — بیم سے جس کے، صبا، توڑے ہے صد جا زنّار
رنگریزِ گل و جامِ دوجہاں ناز و نیاز — اولیں دورِ امامت، طربِ ایجادِ بہار
جوشِ طوفانِ کرم، ساقیِ کوثر ساغر — نُہ فلک، آئنہ ایجادِ کفِ گوہر بار
پہنے ہے پیرہنِ کاغذِ ابری، نیساں — یہ تُنک مایہ، ہے فریادیِ جوشِ ایثار
وہ شہنشاہ کہ جس کی پئے تعمیرِ سرا م — چشمِ جبریل، ہوئی قالبِ خشتِ دیوار
فلک العرش، ہجومِ خمِ دوشِ مزدور م — رشتۂ فیضِ ازل، سازِ طنابِ معمار
سبزۂ نُہ چمن، و یک خطِ پشتِ لبِ بام م — رفعتِ ہمتِ صد عارف، و یک اوجِ حصار

واں کے خاشاک سے حاصل ہو جسے یک پرِ کاہ   م   وہ رہے مروحۂ بالِ پری سے بے زار
پر یہ دولت، تھی نصیبِ نگہِ معنیٔ ناز   کہ ہوا صورتِ آئینہ میں، جوہر بیدار
ذرّہ اس گرد کا خورشید کو، آئینۂ ناز   م   گرد اس دشت کی، امّید کو، احرامِ بہار
خاکِ صحرائے نجف، جوہرِ سیرِ عُرفا   م   چشمِ نقشِ قدم، آئینۂ بختِ بیدار
اے خوشا! مکتبِ شوق و بلدستانِ مراد   سبقِ نازکی، ہے عجز کو صد جا تکرار
مشقیِ نقشِ قدم، نسخۂ آبِ حیواں   جادۂ دشتِ نجف، عمرِ خضر کا طومار
جلوہ تمثال ہے، ہر ذرّۂ نیرنگ سواد   بزمِ آئینۂ تصویر نما، مشتِ غُبار
دو جہاں طالبِ دیدار تھا، یا رب کہ ہنوز   چشمکِ ذرّہ سے ہے گرم، نگہ کا بازار
ہے، نفس، مایۂ شوقِ دو جہاں ریگِ رواں   پائے رفتار کم، و حسرتِ جولاں بسیار
آفرینش کو ہے، واں سے طلبِ مستیٔ ناز   م   عرضِ خمیازۂ ایجاد ہے ہر موجِ غبار
دشتِ الفت چمن، و آبلہ مہماں پرور   دلِ جبریل، کفِ پا پہ ملے ہے رخسار
یاں تک انصاف نوازی کہ اگر ریزۂ سنگ   بے خبر دے بکفِ پائے مسافر آزار
یک بیاباں تپشِ بالِ شرر سے، صحرا   مغزِ کہسار میں کرتا ہے فرو، نشترِ خار
فرش اس دشتِ تمنا میں نہ ہوتا، گر، عدل   گرمیِ شعلۂ رفتار سے جلتے خس و خار
ابرِ نیساں سے ملے موجِ گہر کا تاواں   خلوتِ آبلہ میں گم کرے، گر تو، رفتار
یک جہاں بسملِ اندازِ پرافشانی ہے   دام سے اُس کے، قضا کو ہے رہائی دشوار
موجِ طوفانِ غضب، چشمۂ چرخ حباب   ذوالفقارِ شہِ مرداں، خطِ قدرت آثار

موجِ ابروئے قضا، جس کے تصور سے دو نیم   بیم سے جس کے، دلِ شحنۂ تقدیر فگار
شعلۂ تحریر سے اس برق کی، ہے کلکِ قضا   بالِ جبریل سے مسطر کشِ سطرِ زنہار
موجِ طوفاں ہو، اگر خونِ دو عالم ہستی   ہے حنا کو سرِ ناخن سے گزرنا دشوار
دشتِ تسخیر ہو، گر گردِ خرامِ دُلدُل   نعلِ در آتشِ ہر ذرّہ ہے، تیغِ کہسار
بالِ رعنائیِ دُم، موجۂ گلبندِ قبا   گردشِ کاسۂ سُم، چشمِ پری آئنہ دار
گردِ رہ اُس کی بھریں شیشۂ ساعت میں اگر   ہر نفس راہ میں لوٹے، نفسِ سیل و نہار
نرم رفتار ہو جس کوہ پہ وہ برق گداز   رفتنِ رنگِ حنا ہے، تپشِ بالِ شرار
ہے سراسر رویِ عالمِ ایجاد اُسے   جیبِ خلوت کدۂ غنچہ میں، جولانِ بہار
جس کے حیرت کدۂ نقشِ قدم میں، مانی   خونِ صد برق سے باندھے بکفِ دست نگار
ذوقِ تسلیمِ تمنا سے بہ گلزارِ حضور   عرضِ تسخیرِ تماشا سے بہ دامِ اظہار
مطلعِ تازہ ہوا موجۂ کیفیّتِ دل   جامِ سرشارِ مے و غنچۂ لبریزِ بہار

مطلعِ ثالث [1]

فیض سے تیرے ہے، اے شمعِ شبستانِ بہار   م   دلِ پروانہ چراغاں، پرِ بلبل گلزار
شکلِ طاؤس کرے، آئنہ خانہ پرواز   م   ذوق میں جلوے کے تیرے بہ ہوائے دیدار

[1] ق: پورا عنوان یہ ہے "مطلعِ ثالث فی المدح الحاضر"

○ ... ۱۸۲۱ء

گردِ جولاں سے ہے تیری، بگریبانِ خرام   جلوۂ طور، نمک سودۂ زخمِ تکرار

جس چمن میں ہو، ترا جلوۂ محروم نواز   پرِ طاؤس، کرے گرم نگہ کا بازار

جس ادب گاہ میں تو آئنۂ شوخی ہو   جلوہ، ہے ساقیِ مخموریِ تابِ دیوار

تو وہ ساقی ہے کہ ہر موجِ محیطِ سرِ بہہ   کھینچے خمیازے میں تیرے لبِ ساغر کا خُمار

گرد بادِ آئنہ فتراکِ دماغِ دل ہا   تیرا صحرائے طلب، محفلِ پیمانہ شکار

ذوقِ بے تابیِ دیدار سے تیرے ہے ہنوز   جوشِ جوہر سے، دلِ آئنہ، گلدستۂ خار

تیری اولاد کے غم سے ہے، بروئے گردوں   م   سلکِ اختر میں مہِ نو، مژۂ گوہر بار

مدح میں تیری نہاں، زمزمۂ نعتِ نبیؐ   م   جام سے تیرے عیاں، بادۂ جوشِ اسرار

ہم عبادت کو، ترا نقشِ قدم، مُہرِ نماز   م   ہم ریاضت کو، ترے حوصلے سے استظہار

تیرا پیمانۂ مے، نسخۂ ادوارِ ظہور   تیرا نقشِ قدم، آئینۂ شانِ اظہار

آیتِ رحمتِ حق، بسملۂ مصحفِ ناز   مسطرِ موجۂ دیباچۂ درسِ اسرار

قبلۂ نورِ نظر، کعبۂ اعجازِ مسیح   مژۂ دیدۂ نخچیر سے، نبضِ بیمار

تہمتِ بے خودیِ کفر نہ کھینچے، یارب   کمیِ ربطِ نیاز، وخطِ نازِ بسیار

ناز پروردۂ صد رنگِ تمنا ہوں، ولے   پرورش پائی ہے، جوں غنچہ، بہ خونِ اظہار

تنگیِ حوصلہ، گردابِ دو عالم آداب   دیدِ یک غنچہ سے ہوں بسملِ نقصانِ بہار

رشکِ نظارہ تھی یک برقِ تجلی کہ ہنوز   تشنۂ خونِ دو عالم ہوں، بہ عرضِ تکرار

وحشتِ فرصتِ یک جیبِ کشش نے کھویا   صورتِ رنگِ حنا، ہاتھ سے دامانِ بہار

○ ... ۱۸۲۱ء

شعلہ آغاز، ولے حیرتِ داغِ انجام   موجِ مے لیک زِ سر تا قدم آغوشِ خمار

ہے اسیرِ ستمِ کشمکشِ دامِ وفا   دلِ وارستۂ ہفتاد و دو ملت بیزار

مژۂ خواب سے کرتا ہوں، بآسایشِ درد   بخیۂ زخمِ دلِ چاک، بہ یک دستہ شرار

محرمِ دردِ گرفتاریِ مستی معلوم   ہوں نفس سے، صفتِ نغمہ، بہ بندِ رگِ تار

تھا سرِ سلسلہ جنبانیِ صد عمرِ ابد   ساز ہا مفت بہ ریشم کدۂ نالۂ زار

لیکن اس رشتۂ تحریر میں سرتاسرِ فکر   ہوں، بہ قدرِ عددِ حرفِ علیؑ، سبحہ شمار

جوہرِ دستِ دعا آئنہ، یعنی تاثیر   م   یک طرف نازشِ مژگاں، و دگر سوئے غمِ خار

مردمک سے، ہو عزا خانۂ اقبالِ نگاہ   م   خاکِ در کی ترے، جو چشم، نہ ہو آئنہ دار

دشمنِ آلِ نبیؐ کو، بطرب خانۂ دہر   م   عرضِ خمیازۂ سیلاب ہو، طاقِ دیوار

دوست اس سلسلۂ ناز کے، جوں سنبل و گل   ابرِ میخانہ کریں ساغرِ خُرشید شکار

لنگرِ عیش پہ سرشارِ تماشائے دوام   کہ ہے خونِ خزاں سے بہ حنا پائے بہار

زلفِ معشوق کشش، سلسلۂ وحشتِ ناز   دلِ عاشق، شکن آموزِ خمِ طرّۂ یار

مئے تمثال پری، نشۂ مینا آزاد   دلِ آئینہ طرب، ساغرِ بختِ بیدار

دیدِ تا دل، اسدؔ آئینۂ یک پرتوِ شوق   م   فیضِ معنی سے، خطِ ساغرِ راقم سرشار

(٢)

∞ دہر، جز جلوۂ یکتائیِ معشوق نہیں م ہم کہاں ہوتے، اگر حسن نہ ہوتا خود بیں؟
توڑے[1] ہے عجزِ تنک حوصلہ بر روئے زمیں سجدۂ تمثال وہ آئینہ، کہیں جس کو جبیں
توڑے ہے نالہ، سر رشتۂ پاسِ انفاس سر کرے ہے دلِ حیرت زدہ، شغلِ تسکیں
بے دلی ہائے تماشا، کہ نہ عبرت ہے، نہ ذوق م بیکسی ہائے تمنا، کہ نہ دنیا ہے نہ دیں
ہرزہ ہے، نغمۂ زیر و بمِ ہستی و عدم م لغو ہے آئنۂ فرقِ جنون و تمکیں
یاس، تمثالِ بہار آئنۂ استغنا وہم، آئینۂ پیدائیِ تمثالِ یقیں
خوں ہوا جوشِ تمنا سے، دو عالم کا دماغ بزمِ یاس آں سوئے پیدائی و اخفا رنگیں
مثلِ مضمونِ وفا، باد بدستِ تسلیم م صورتِ نقشِ قدم، خاک بہ فرقِ تمکیں
خانہ ویرانیِ امید و پریشانیِ بیم جوشِ دوزخ ہے خزانِ چمنِ خلدِ بریں
لافِ دانش غلط، و نفعِ عبادت معلوم م دُردِ یک ساغرِ غفلت ہے، چہ دنیا، وچہ دیں
بادِ افسانۂ بیمار ہے، عیسیٰ کا نفس استخواں ریزۂ موراں ہے، سلیماں کا نگیں
نقشِ معنی ہمہ، خمیازۂ عرضِ صورت م سخنِ حق ہمہ، پیمانۂ ذوقِ تحسیں
عشق، بے ربطیِ شیرازۂ اجزائے حواس م وصل، زنگارِ رخِ آئنۂ حسنِ یقیں
کوہ کن، گرسنہ مزدورِ طرب گاہِ رقیب م بے ستوں، آئنۂ خوابِ گرانِ شیریں

∞ یہ مطلع بعد کا اضافہ ہے اور بقول مولانا عرشی، پہلے پہل قبا کے حاشیے میں درج ہوا
لہ ق ۔ اس کا عنوان ہے "ایضاً د قصیدۂ حیدری ع فی المنقبت"

موجِ خمیازۂ یک نشہ، چہ اسلام، وچہ کفر کجیِ یک خطِ مسطر، چہ توہّم، چہ یقیں
قبلہ و ابروئے بُت یک رہِ خوابیدۂ شوق کعبہ و بت کدہ، یک محملِ خوابِ رنگیں
کس نے دیکھا نفَسِ اہلِ وفا آتش خیز؟ م کس نے پایا، اثرِ نالۂ دل ہائے حزیں؟
عیشِ بسمل کدۂ عیدِ حریفاں معلوم خوں ہو آئینہ، کہ ہو جامۂ طفلاں رنگیں
سامعِ زمزمۂ اہلِ جہاں ہوں، لیکن م نہ سر و برگِ ستائش، نہ دماغِ نفریں
نزعِ مخمور ہوں اُس دید کی دھن میں کہ مجھے رشتۂ سازِ ازل ہے، نگہِ بازپسیں
حیرت، آفت زدۂ عرضِ دو عالم نیرنگ مومِ آئینۂ ایجاد ہے، مغزِ تمکیں
وحشتِ دل سے پریشاں ہیں، چراغانِ خیال باندھوں ہوں آئنے پر چشمِ پری سے آئیں
کوچہ دیتا ہے پریشاں نظری پر، صحرا رمِ آہو کو ہے ہر ذرّے کی چشمک میں کمیں
چشمِ امید سے گرتے ہیں، دو عالم جوں اشک یاس بہ پیمانہ کشِ گریۂ مستانہ نہیں
کس قدر فکر کو ہے نالِ قلم موئے دماغ کہ ہوا خوں نگہِ شوق میں نقشِ تمکیں
عذرِ لنگ آفتِ جولانِ ہوس ہے، یارب جل اُٹھے گرمیِ رفتار سے، پائے چوبیں
نہ تمنا، نہ تماشا، نہ تحیّر، نہ نگاہ گردِ جوہر میں ہے آئینۂ دل پردہ نشیں
کھینچوں ہوں آئنے پر خندۂ گل سے مسطر نامہ، عنوانِ بیانِ دلِ آزردہ نہیں
رنجِ تعظیمِ مسیحا نہیں اٹھتا مجھ سے درد ہوتا ہے مرے دل میں، جو توڑوں بالیں
بس کہ گستاخیِ اربابِ جہاں سے ہوں ملول پرِ پروانہ، مری بزم میں ہے خنجرِ کیں
اے عبارت، تجھے کس خط سے ہے درسِ نیرنگ اے نگہ، تجھ کو ہے کس نقطے میں مشقِ تسکیں؟

○ ... ۱۸۲۱ء

کس قدر ہرزہ سرا ہوں کہ عیاذاً باللہ! م یک قلم خارجِ آدابِ وقار و تمکیں
جلوۂ ریگِ رواں دیکھ کے گردوں ہر صبح خاک پر توڑے ہے آئینۂ نازِ پروِیں
شورِ اوہام سے مت ہو شبِ خونِ انصاف گفتگو بے مزہ، و زخمِ تمنا نمکیں
ختم کر ایک اشارت میں عباراتِ نیاز جوں مہِ نو، ہے نہاں گوشۂ ابرو میں جبیں
نقش "لاحول" لکھ اے خامۂ ہذیاں تحریر م "یا علی" عرض کر، اے فطرتِ وسواس قریں
معنیِ لفظِ کرم، بسملۂ نسخۂ حسن قبلۂ اہلِ نظر، کعبۂ اربابِ یقیں
جلوہ رفتارِ سرِ جادۂ شرعِ تسلیم نقشِ پا جس کا ہے توحید کو معراجِ جبیں
کس سے ممکن ہے تری مدح، بغیر از واجب؟ م شعلۂ شمع، مگر شمع پہ باندھے آئیں
ہو، وہ سرمایۂ ایجاد، جہاں گرمِ خرام م ہر کفِ خاک ہے واں گردۂ تصویرِ زمیں
مظہرِ فیضِ خدا، جان و دلِ ختمِ رسل م قبلۂ آلِ نبیؐ، کعبۂ ایجادِ یقیں
نسبتِ نام سے اُس کے ہے یہ رتبہ کہ رہے م اَبَداً پشتِ فلک خم شدۂ نازِ زمیں
جلوہ پرداز ہو، نقشِ قدم اس کا، جس جا م وہ کفِ خاک ہے ناموسِ دو عالم کی امیں
فیضِ خلق اُس کا ہی شامل ہے کہ ہوتا ہے سدا م بوئے گُل سے نفسِ بادِ صبا عطر آگیں
بُرّشِ تیغ کا اُس کی، ہے جہاں میں چرچا م قطع ہو جائے نہ، سر رشتۂ ایجاد کہیں
کوہ کو، بیم سے اُس کے ہے جگر باختگی نہ کرے نذرِ صدا، ورنہ، متاعِ تمکیں
کفر سوز اُس کا وہ جلوہ ہے کہ جس سے ٹوٹے م رنگِ عاشق کی طرح، رونقِ بت خانۂ چیں
وصفِ دُلدُل، ہے مرے مطلعِ ثانی کی بہار جنّتِ نقشِ قدم سے ہوں، ہیں اس کی گلچیں

○ ... ۱۸۲۱ء

مطلع[1]

گردِ رہ، سرمہ کشِ دیدۂ اربابِ یقیں نقشِ ہر گام، دو عالم صفہاں زیرِ نگیں
برگِ گل کا، ہو جو طوفان ہوا میں عالم اُس کے جولاں میں نظر آئے ہے یوں دامنِ زیں
اُس کی شوخی سے بہ حیرت کدۂ نقشِ خیال فکر کو حوصلۂ فرصتِ ادراک نہیں
جلوۂ برق سے ہو جائے نگہ، عکس پذیر اگر آئینہ بنے حیرتِ صورت گرِ چیں
جاں پناہا! دل و جاں فیض رسانا! شاہا! م وصیِ[2] ختمِ رُسل تو ہے، بفتوائے یقیں
ذوقِ گلچینیِ نقشِ کفِ پا سے تیرے عرش چاہے ہے کہ ہو دریہ ترے خاک نشیں
تجھ میں اور غیر میں نسبت ہے، ولیکن بہ تضاد وصیِ ختمِ رُسل تو ہے باثباتِ یقیں
جسمِ اطہر کو ترے، دوشِ پیمبر، منبر م نامِ نامی کو ترے ناصیۂ عرش، نگیں
تیری مدحت کے لیے ہیں دل و جاں، کام و زباں م تیری تسلیم کو ہیں لوح و قلم، دست و جبیں
آستاں پر ہے ترے جوہرِ آئینۂ سنگ م رقمِ بندگیِ حضرتِ جبریلِ امیں
تیرے در کے لیے اسبابِ نثار آمادہ م خاکیوں کو جو خدا نے دیے جان و دل و دیں
دادِ دیوانگیِ دل کہ ترا مدحت گر ذرّے سے باندھے ہے خورشیدِ فلک پر آئیں
کس سے ہو سکتی ہے مدّاحیِ ممدوحِ خدا؟ م کس سے ہو سکتی ہے آرایشِ فردوسِ بریں؟

۱۔ ق = مطلعِ ثانی
۲۔ " = اصلاً یہاں مصرعِ ثانی یہ تھا ہے کہ تجھ سے ہے بہارِ چمنستانِ یقیں۔ "وصیِ ختمِ رُسل..." والا مصرع اس سے آگے کا ایک شعر چھوڑ کر آتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے۔

جنسِ[۱] بازارِ معاصی، اسد اللہ اسدؔ م کہ سوا تیرے کوئی اس کا خریدار نہیں

شوخیِ عرضِ مطالب میں ہے گستاخِ طلب م ہے ترے حوصلۂ فضل پر از بس کہ یقیں

دے دعا کو مری وہ مرتبۂ حسنِ قبول م کہ اجابت کہے ہر حرف پہ سو بار "آمیں"

غمِ شبیّر سے ہو سینہ یہاں تک لبریز م کہ رہیں خونِ جگر سے مری آنکھیں رنگیں

طبع کو، الفتِ دُلدُل میں، یہ سرگرمیِ شوق م کہ جہاں تک چلے اس سے قدم اور مجھ سے جبیں

دلِ الفت نسب، و سینۂ توحید فضا م نگہِ جلوہ پرست، و نفسِ صدق گزیں

صَرفِ اعدا، اثرِ شعلہ و دودِ دوزخ م وقفِ احباب، گل و سُنبلِ فردوسِ بریں

(۳)

▭ بہ گمانِ قطعِ زحمت نہ دوچارِ خامشی ہو کہ زبانِ سُرمہ آلود، نہیں تیغِ اصفہانی

بہ فریبِ آشنائی، بہ خیالِ بے وفائی نہ رکھ آپ سے تعلق، مگر ایک بدگمانی

نظرے سوے کہستاں، نہیں غیرِ شیشہ ساماں جو گدازِ دل ہو مطلب، تو چمن ہے سنگ جانی

بہ فرازگاہِ عبرت، چہ بہار و کو تماشا ؟ کہ نگاہ ہے سیہ پوش بہ عزاے زندگانی

بہ فراقِ رفتہ یاراں، خط و حرف، مو پریشاں دلِ غافل از حقیقت ہمہ ذوقِ قصّہ خوانی

۱۔ ق : یا علیؑ، جنسِ معاصی.....

▭ اس قصیدے کے کل ۲۹ اشعار ہیں سے تین شعر غزل (دے جو نہ نقدِ داغِ دل کی کرے شعلہ پاسبانی) کے طور پر الگ سے متداول دیوان میں درج ہوئے ہیں۔ اس لیے یہ قصیدہ اب ۲۶ اشعار پر مشتمل ہے۔

تپشِ دلِ شکستہ، پئے عبرت آگہی ہے کہ نہ دے عنانِ فرصت بہ کشاکشِ زبانی

نہ وفا کو آبرو ہے، نہ جفا تمیز جُو ہے چہ حسابِ جانفشانی ؟ چہ غرورِ دلستانی ؟

بہ شکنجِ جستجوہا، بہ سرابِ گفتگوہا تگ و تازِ آرزوہا، بہ فریبِ شادمانی

نہیں شاہراہِ اوہام، بجز آں سُوے سیدن تری سادگی ہے، غافل، درِ دل پہ پاسبانی

چہ امید و ناامیدی ؟ چہ نگاہ و بے نگاہی ؟ ہمہ عرضِ ناشکیبی ؟ ہمہ سازِ جاں ستانی

اگر آرزو ہے راحت، تو عبث بہ خوں تپیدن کہ خیال ہو تعب کش بہ ہواے کامرانی

شر و شورِ آرزو سے تب و تابِ عجز بہتر نہ کرے اگر ہوس پر، غمِ بیدلی، گرانی

ہوسِ فروختن ہا، تب و تابِ سوختن ہا سرِ شمع نقشِ پا ہے۔ بسپاسِ ناتوانی

شررِ اسیرِ دل کو ملے اوجِ عرضِ اظہار جو بہ صورتِ چراغاں کرے، شعلہ نردبانی

ہوے مشقِ جرأتِ ناز، رہ و رسمِ طرحِ آداب خمِ پشت خوشنما تھا بہ گزارشِ جوانی

اگر آرزو رسا ہو، پئے دردِ دل دوا ہو وہ اجل کہ خوں بہا ہو، بہ شہیدِ ناتوانی

غمِ عجز کا سفینہ بہ کنارِ بیدلی ہے مگر ایک شہپرِ مور کرے سازِ بادبانی

مجھے انتعاشِ غم نے پئے عرضِ حال بخشی ہوسِ غزل سرائی، تپشِ فسانہ خوانی

دلِ ناامید کیونکر بہ تسلّی آشنا ہو جو امیدوار رہیے، نہ بہ مرگِ ناگہانی

مجھے بادۂ طرب سے بہ خمارگاہِ قسمت جو ملی تو تلخ کامی، جو ہوئی تو سرگرانی

نہ ستم کر اب تو مجھ پر کہ وہ دن گئے کہ ہاں تھی مجھے طاقت آزمائی، تجھے الفت آزمائی

○ ... ۱۸۲۱ء

بہ ہزار امید واری، رہی ایک اشک باری　　نہ ہوا حصولِ زاری، بجز آستیں فشانی
کروں عذرِ ترکِ ہمت سو کہاں وہ بیدماغی؟　　نہ غرورِ میرزائی، نہ فریبِ ناتوانی
ہمہ یک نفس تپش سے تب و تابِ ہجرمت پوچھ　　کہ ستم کشِ جنوں ہوں نہ بقدرِ زندگانی
کفِ موجۂ حیا ہوں بہ گدازِ عرضِ مطلب　　کہ سرشکِ قطرہ زن ہے بہ پیامِ دل رسانی
یہی بار بار جی میں مرے آئے ہے کہ غالبؔ
کروں خوانِ گفتگو پر دل و جاں کی میہمانی

غزلیات

عالم، جہاں بعرضِ بساطِ وجود تھا　　جوں صبح، چاکِ جیب مجھے تار و پود تھا
بازی خورِ فریب ہے، اہلِ نظر کا ذوق　　ہنگامہ، گرمِ حیرتِ بود و نمود تھا
عالم، طلسمِ شہرِ خموشاں ہے سر بسر°　　یا میں غریبِ کشورِ گفت و شنود تھا
جز قیس، اور کوئی نہ آیا بروئے کار　م　صحرا، مگر، بہ تنگیِ چشمِ حسود تھا
آشفتگی نے نقشِ سویدا کیا درست　م　ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا
تھا، خواب میں، خیال کو تجھ سے معاملہ　م　جب آنکھ کھل گئی، نہ زیاں تھا، نہ سود تھا
تیشے بغیر مر نہ سکا کوہ کن، اسدؔ　م　سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

° یہ شعر پہلے پہل متنِ قا میں درج ہوا

○ ... ۱۸۲۱ء

تنگیِ رفیقِ رہ تھی، عدم یا وجود تھا　　میرا سفر بہ طالعِ چشمِ حسود تھا
تو یک جہاں قماشِ ہوس جمع کر، کہ میں　　حیرت متاعِ عالمِ نقصان و سود تھا
گردش محیطِ ظلم رہا جس قدر، فلک　　میں پائمالِ غمزۂ چشمِ کبود تھا
پوچھا تھا گرچہ یار نے احوالِ دل، مگر　　کس کو دماغِ منتِ گفت و شنود تھا
لیتا ہوں، مکتبِ غمِ دل میں سبق ہنوز　م　لیکن یہی کہ "رفت" گیا اور "بود" تھا
ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی　م　میں، ورنہ، ہر لباس میں ننگِ وجود تھا
خور، شبنم آشنا نہ ہوا، ورنہ میں، اسدؔ
سرتاقدم گزارشِ ذوقِ سجود تھا

کہتے ہو: "نہ دیں گے ہم" دل اگر پڑا پایا　م　دل کہاں کہ گم کیجے؟ ہم نے مدعا پایا
شورِ پندِ ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا　م　آپ سے کوئی پوچھے "تم نے کیا مزا پایا؟"
ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب؟　　ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا
بے دماغِ خجلت ہوں، رشکِ امتحاں تا کے؟　　ایک بےکسی، تجھ کو عالم آشنا پایا
سادگی و پرکاری، بےخودی و ہشیاری　م　حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا
خاکبازیِ امید، کارخانۂ طفلی　　یاس کو دو عالم سے لب بخندہ وا پایا
کیوں نہ وحشتِ غالبؔ باج خواہِ تسکیں ہو؟
کشتۂ تغافل کو خصمِ خوں بہا پایا

○ ... ۱۸۲۱ء

عشق سے طبیعت نے، زیست کا مزا پایا م درد کی دوا پائی، دردِ بے دوا پایا
غنچہ پھر لگا کھلنے، آج ہم نے اپنا دل م خوں کیا ہوا دیکھا، گم کیا ہوا پایا
فکرِ نالہ میں، گویا، حلقہ ہوں زسر تا پا عضو عضو، جوں زنجیر، یک دلِ صدا پایا
حالِ دل نہیں معلوم، لیکن اس قدر یعنی م ہم نے بارہا ڈھونڈھا، تم نے بارہا پایا
شب نظارہ پرور تھا خواب میں خرام اُس کا صبح، موجۂ گل کو نقشِ بوریا پایا
جس قدر جگر خوں ہو، کوچہ دادنِ گل ہے زخمِ تیغِ قاتل کو طرفہ دلکشا پایا
ہے نگیں کی پاداری، نامِ صاحبِ خانہ ہم سے تیرے کوچے نے، نقشِ مدّعا پایا
دوستدارِ دشمن ہے، اعتمادِ دل معلوم م آہ بے اثر دیکھی، نالہ نارسا پایا
نَے اسدؔ جفا سائل، نَے ستم جنوں مائل
تجھ کو جس قدر ڈھونڈھا، الفت آزما پایا

کارخانے سے جنوں کے بھی، میں عریاں نکلا میری قسمت کا نہ ایک آدھ گریباں نکلا
ساغرِ جلوۂ سرشار ہے، ہر ذرّۂ خاک شوقِ دیدار بلا آئنہ ساماں نکلا
زخم نے داد نہ دی تنگیِ دل کی، یارب! م تیر بھی سینۂ بسمل سے پَر افشاں نکلا
بوئے گل[1]، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل م جو تری بزم سے نکلا، سو پریشاں نکلا
کچھ کھٹکتا تھا مرے سینے میں، لیکن آخر جس کو دل کہتے تھے، سو تیر کا پیکاں نکلا

---

[1] ق = ے عشرت ایجاد چہ بوے گل و کو دودِ چراغ

○ ... ۱۸۲۱ء

کس قدر خاک ہوا ہے دلِ مجنوں، یارب نقشِ ہر ذرّہ، سُویدائے بیاباں نکلا
دل میں پھر گریے نے اک شور اٹھایا غالبؔ م آہ! جو قطرہ نہ نکلا تھا، سو طوفاں نکلا

دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلّی نہ ہوا م ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا
نہ ہوئی ہم سے رقم حیرتِ خطِّ رخِ یار صفحۂ آئنہ، جولاں گہِ طوطی نہ ہوا
وسعتِ رحمتِ حق دیکھ کہ بخشا جاوے مجھ سا کافر کہ جو ممنونِ معاصی نہ ہوا
سبزۂ خط سے ترا کاکلِ سرکش نہ دبا م یہ زمُرّد بھی حریفِ دمِ افعی نہ ہوا
میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں م وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا
دل†، گزرگاہِ خیالِ مے و ساغر ہی سہی م گر نفَس جادۂ سرمنزلِ تقوی نہ ہوا
ہوں ترے وعدہ نہ کرنے میں بھی راضی کہ کبھی م گوش، منّت کشِ گلبانگِ تسلّی نہ ہوا
کس سے محرومیِ قسمت کی شکایت کیجے؟ م ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں، سو وہ بھی نہ ہوا
مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالبؔ م ناتوانی سے، حریفِ دمِ عیسی نہ ہوا

جب، بتقریبِ سفر، یار نے محمل باندھا م تپشِ شوق نے ہر ذرّے پہ اک دل باندھا
ناتوانی ہے تماشائیِ عمرِ رفتہ رنگ نے آئنہ آنکھوں کے مقابل باندھا
اہلِ بینش نے بہ حیرت کدۂ شوخیِ ناز م جوہرِ آئنہ کو طوطیِ بسمل باندھا
اصطلاحاتِ اسیرانِ تغافل مت پوچھ جو گرہ آپ نہ کھولی، اُسے مشکل باندھا

---

† یہ شعر پہلے پہل حاشیہ ق میں بڑھایا گیا

○ ... ۱۸۲۱ء

یاس و اُمیّد نے یک عربدہ میداں مانگا م عجزِ ہمت نے طلسمِ دلِ سائل باندھا
نہ بندھے تشنگیِ شوق کے مضموں، غالب م گرچہ دل کھول کے، دریا کو بھی ساحل باندھا
نوکِ ہر خار سے تھا بس کہ سرِ دزدیِ زخم
جوں نمد، ہم نے کفِ پا پہ اسدؔ، دل باندھا

شوق ہر رنگ، رقیبِ سر و ساماں نکلا م قیسؔ، تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا
دلِ حسرت زدہ، تھا مائدۂ لذّتِ درد م کام یاروں کا بقدرِ لب و دنداں نکلا
شورِ رسوائیِ دل دیکھ کہ یک نالۂ شوق لاکھ پردے میں چھپا، پر وہی عریاں نکلا
شوخیِ رنگِ حنا، خونِ وفا سے، کب تک؟ آخر، اے عہد شکن، تو بھی پشیماں نکلا
جوہر ایجادِ خطِ سبز ہے، خود بینیِ حسن جو نہ دیکھا تھا، سو آئینے میں پنہاں نکلا
ہے نو آموزِ فنا، ہمّتِ دشوار پسند[1] م سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا
میں بھی معذورِ جنوں ہوں اسدؔ اے خانہ خراب
پیشوا لینے مجھے گھر سے بیاباں نکلا

نہ ہوگا، یک بیاباں ماندگی سے، ذوق کم میرا م حبابِ موجۂ رفتار ہے، نقشِ قدم میرا
رہِ خوابیدہ، تھی گردن کشِ یک درسِ آگاہی زمیں کو سیلیِ اُستاد ہے، نقشِ قدم میرا

---

[1] ق = دشواریِ شوق

○ ... ۱۸۲۱ء

محبّت تھی چمن سے، لیکن اب یہ بیدماغی ہے م کہ موجِ بوئے گل سے، ناک میں آتا ہے، دم میرا
سراغ آوارۂ عرضِ دو عالم شورِ محشر ہوں پر افشاں ہے غبار، آں سوئے صحرائے عدم میرا
نہ ہو وحشت کشِ درسِ سرابِ سطرِ آگاہی غبارِ راہ ہوں، بے مدّعا ہے پیچ و خم میرا
ہوائے صبح، یک عالم گریباں چاکیِ گل ہے دہانِ زخم پیدا کر، اگر کھاتا ہے غم میرا
اسدؔ، وحشت پرستِ گوشۂ تنہائیِ دل ہوں
برنگِ موجِ مے، خمیازۂ ساغر ہے، رم میرا

ضعفِ جنوں کو، وقتِ تپش، در بھی دور تھا اک گھر میں، مختصر سا بیاباں ضرور تھا
اے وائے غفلتِ نگہِ شوق! ورنہ یاں ہر پارہ سنگ، لختِ دلِ کوہِ طور تھا
درسِ تپش ہے برق کو، اب جس کے نام سے وہ دل ہے یہ کہ جس کا تخلّص صبور تھا
شاید کہ مر گیا ترے رخسار دیکھ کر پیمانہ رات، ماہ کا لبریزِ نور تھا
آئینہ دیکھ، اپنا سا منہ لے کے رہ گئے م صاحب کو، دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا
قاصد کو، اپنے ہاتھ سے گردن نہ ماریے م اس کی خطا نہیں ہے، یہ میرا قصور تھا
+ جنّت ہے تیری تیغ کے کشتوں کی منتظر جوہر سواد، جلوۂ مژگانِ حور تھا
ہر رنگ میں جلا اسدِؔ فتنہ انتظار
پروانۂ تجلّیِ شمعِ ظہور تھا

+ یہ شعر پہلی بار حاشیہ ق میں بڑھایا گیا

○ ... ۱۸۲۱ء

خود پرستی سے رہے باہمد گر ناآشنا   بیکسی میری شریک، آئینہ تیرا آشنا
آتشِ موئے دماغِ شوق ہے، تیرا تپاک   ورنہ ہم کس کے ہیں، اے داغِ تمنا، آشنا؟
رشک[+] کہتا ہے کہ اُس کا غیر سے اخلاص حیف!   م   عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا؟
بے[□] دماغی شکوہ سنجِ رشکِ ہم دیگر نہیں   یار تیرا جامِ مے، خمیازہ میرا آشنا
جوہرِ آئینہ جز رمزِ سرِ مژگاں نہیں   آشنا کی، ہمد گر سمجھے ہے ایما آشنا
ربطِ یک شیرازۂ وحشت ہیں، اجزائے بہار   سبزہ بیگانہ، صبا آوارہ، گل نا آشنا!
ذرّہ ذرّہ، ساغرِ میخانۂ نیرنگ ہے   م   گردشِ مجنوں بہ چشمک ہائے لیلیٰ آشنا
شوق[+]، ہے ساماں طرازِ نازشِ اربابِ عجز   م   ذرّہ صحرا دستگاہ، و قطرہ دریا آشنا
میں اور ایک آفت کا ٹکڑا وہ دلِ وحشی کہ ہے   م   عافیت کا دشمن، اور آوارگی کا آشنا
شکوہ[□] سنجِ رشکِ ہم دیگر نہ رہنا چاہیے   م   میرا زانو مونس، اور آئینہ تیرا آشنا
کوہ کن نقّاشِ یک تمثالِ شیریں تھا، اسد   م   سنگ سے سر مار کر، ہووے نہ پیدا آشنا

شب خمارِ شوقِ ساقی رستخیز اندازہ تھا   م   تا محیطِ بادہ، صورت خانۂ خمیازہ تھا
یک قدم وحشت سے درسِ دفترِ امکاں کھلا   م   جادہ، اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا

□ عرشی صاحب نے پہلے مصرعے کی مماثلت کو دیکھتے ہوئے ان دونوں اشعار کو ایک ہی شعر مانا ہے۔ میری رائے میں ان اشعار کا الگ الگ درج کرنا ضروری ہے۔
+ یہ اشعار پہلی بار حاشیہ ق میں بڑھائے گئے

○ ... ۱۸۲۱ء

ہوں چراغانِ ہوس، جوں کاغذِ آتش زدہ   داغ، گرمِ کوششِ ایجادِ داغِ تازہ تھا
مانعِ وحشت خرامی ہائے لیلیٰ کون ہے؟   م   خانۂ مجنونِ صحرا گرد، بے دروازہ تھا
پوچھ مت رسوائیِ اندازِ استغنائے حُسن   م   دست مرہونِ حنا، رخسار رہنِ غازہ تھا
نالۂ دل نے دیئے اوراقِ لختِ دل، بہ باد   م   یادگارِ نالہ، اک دیوانِ بے شیرازہ تھا
بے نوائی تر صدائے نغمۂ شہرت اسد
بوریا، یک نیستان عالم بلند آوازہ تھا

وہ مری چینِ جبیں سے، غمِ پنہاں سمجھا   م   رازِ مکتوب بہ بے ربطیِ عنواں سمجھا
یک الف بیش نہیں، صیقلِ آئینہ ہنوز   م   چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا
شرحِ اسبابِ گرفتاریِ خاطر مت پوچھ   م   اس قدر تنگ ہوا دل کہ میں زنداں سمجھا
ہم نے وحشت کدۂ بزمِ جہاں میں جوں شمع   شعلۂ عشق کو اپنا سر و ساماں سمجھا
تھا گریزاں مژۂ یار سے، دل، تا دمِ مرگ   م   دفعِ پیکانِ قضا اس قدر آساں سمجھا
عجز سے اپنے یہ جانا کہ وہ بدخو ہوگا   م   نبضِ خس سے تپشِ شعلۂ سوزاں سمجھا
سفرِ عشق میں کی ضعف نے راحت طلبی   م   ہر قدم، سائے کو میں اپنے شبستاں سمجھا
بدگمانی نے نہ چاہا اُسے سرگرمِ خرام   م   رُخ پہ ہر قطرہ عرق، دیدۂ حیراں سمجھا
دل دیا جان کے کیوں اسکو وفادار، اسد؟   م   غلطی کی کہ جو کافر کو مسلماں سمجھا

○ ...۱۸۲۱ء

گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگیِ جا کا م گہر میں محو ہوا ، اضطراب دریا کا
یہ جانتا ہوں کہ تو اور پاسخِ مکتوب م مگر، ستم زدہ ہوں، ذوقِ خامہ فرسا کا
+حِنائے پائے خزاں ہے، بہار اگر ہے یہی م دوامِ کلفتِ خاطر ہے، عیش دنیا کا
ملی نہ وسعتِ جولانِ یک جنوں ہم کو عدم کو لے گئے دل میں غبارِ صحرا کا
مرا شمول ہر اک دل کے پیچ تاب میں ہے میں مدعا ہوں تپشِ نامۂ تمنا کا
غمِ فراق میں تکلیفِ[1] سیرِ باغ نہ دو م مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بے جا کا
+ہنوز محرمیِ حسن کو ترستا ہوں م کرے ہے، ہر بُنِ مُو، کام چشمِ بینا کا
+دل اس کو پہلے ہی ناز و ادا سے دے بیٹھے م ہمیں دماغ کہاں حسن کے تقاضا کا؟
نہ کہہ کہ گریہ بمقدارِ حسرتِ دل ہے م مری نگاہ میں ہے جمع و خرج دریا کا
فلک[2] کو دیکھ کے کرتا ہوں اس کو یاد، اسدؔ م جفا میں اُس کی، ہے اندازِ کار فرما کا

کس کا خیال، آئنۂ انتظار تھا ہر برگِ گل کے پردے میں دل بیقرار تھا
کس کا جنونِ دید، تمنا شکار تھا آئینہ خانہ، وادیِ جوہر غبار تھا
جوں غنچہ و گل، آفتِ فالِ نظر نہ پوچھ پیکاں سے تیرے، جلوۂ زخم آشکار تھا

---

[1] ق = تکلیفِ سیرِ گُل مت دو
[2] ق میں پہلے یہ شعر یوں تھا : فلک کو دیکھ کے کرتا ہے تجھ کو یاد اسدؔ
اگرچہ گم شدہ ہے کار و بارِ دنیا کا
+ یہ اشعار پہلے پہل حاشیہ ق میں بڑھائے گئے

○ ...۱۸۲۱ء

+ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب م خونِ جگر، ودیعتِ مژگانِ یار تھا
اب میں ہوں اور ماتمِ[1] یک شہرِ آرزو م توڑا جو تو نے آئنہ، تمثال دار تھا
+کم جانتے تھے ہم بھی غمِ عشق کو، پر اب م دیکھا، تو کم ہوئے پہ، غمِ روزگار تھا
دیکھی وفائے فرصتِ رنج و نشاطِ دہر خمیازہ، یک درازیِ عمرِ خمار تھا
+گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں م جاں دادۂ ہوائے سرِ رہگزار تھا
موجِ سرابِ دشتِ وفا کا نہ پوچھ حال م ہر ذرہ، مثلِ جوہرِ تیغ، آبدار تھا
صبحِ قیامت ایک دُمِ گرگ تھی، اسدؔ
جس دشت میں وہ شوخِ دو عالم شکار تھا

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا م آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا
گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی م در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا
وائے دیوانگیِ شوق! کہ ہر دم مجھ کو م آپ جانا اُدھر، اور آپ ہی حیراں ہونا
جلوہ، ازبس کہ، تقاضائے نگہ کرتا ہے م جوہرِ آئنہ بھی چاہے ہے مژگاں ہونا
عشرتِ قتل گہِ اہلِ تمنّا، مت پوچھ م عیدِ نظّارہ ہے، شمشیر کا عریاں ہونا
لے گئے خاک میں ہم داغِ تمنائے نشاط م تو ہو، اور آپ بصد رنگ گلستاں ہونا

---

[1] ق = خونِ دو عالم معاملہ
+ یہ اشعار پہلے پہل حاشیہ ق میں بڑھائے گئے

عشرتِ پارۂ دل، زخمِ تمنّا کھانا م لذّتِ ریشِ جگر، غرقِ نمک داں ہونا
کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ م ہائے! اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا
حیف! اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالبؔ م جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا م دل، جگر تشنۂ فریاد آیا
دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز م پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا
سادگی ہائے تمنّا، یعنی م پھر وہ نیرنگِ نظر یاد آیا
عذرِ واماندگی اے حسرتِ دل م نالہ کرتا تھا، جگر یاد آیا
زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی م کیوں ترا راہ گزر یاد آیا
کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی م گھر ترا، خلد میں گر یاد آیا
آہ! وہ جرأتِ فریاد کہاں م [1]دل سے تنگ آکے جگر یاد آیا
+پھر ترے کوچے کو جاتا ہے خیال م دلِ گم گشتہ، مگر یاد آیا
کوئی ویرانی سی ویرانی ہے م دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا
میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں، اسدؔ م سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

---

[1] ق = دل کے پردے میں

+ یہ شعر پہلے پہل حاشیۂ ق پر بڑھایا گیا

تو دوست کسی کا بھی، ستمگر! نہ ہوا تھا م اوروں پہ ہے وہ ظلم کہ مجھ پر نہ ہوا تھا
چھوڑا مہِ نخشب کی طرح دستِ قضا نے م خورشید ہنوز اُس کے برابر نہ ہوا تھا
توفیق بہ اندازۂ ہمت ہے، ازل سے م آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا
جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم م میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا
میں سادہ دل، آزردگیِ یار سے خوش ہوں م یعنی سبقِ شوقِ مکرّر نہ ہوا تھا
دریائے معاصی تُنک آبی سے ہوا خشک م میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا
جاری تھی، اسدؔ، داغِ جگر سے مری تحصیل م آتش کدہ، جاگیرِ سمندر نہ ہوا تھا

نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ م اگر شراب نہیں، انتظارِ ساغر کھینچ
کمالِ گرمیِ سعیِ تلاشِ دید نہ پوچھ م برنگِ خار، مرے آئنے سے جوہر کھینچ
تجھے بہانۂ راحت ہے انتظار، اے دل م کیا ہے کس نے اشارہ کہ نازِ بستر کھینچ
تری طرف ہے بہ حسرت، نظارۂ نرگس م بہ کوریِ دل و چشمِ رقیب، ساغر کھینچ
بہ نیم غمزہ، ادا کر حقِ ودیعتِ ناز م نیامِ پردۂ زخمِ جگر سے خنجر کھینچ
مرے قدح میں ہے صہبائے آتشِ پنہاں م بہ روئے سفرہ، کبابِ دلِ سمندر کھینچ
نہ کہہ کہ طاقتِ رسوائیِ وصال نہیں — اگر یہی عرقِ فتنہ ہے، مکرّر کھینچ
جنونِ آئنہ، مشتاقِ یک تماشا ہے — ہمارے صفحے پہ بالِ پری سے مسطر کھینچ
خمارِ منّتِ ساقی اگر یہی ہے، اسدؔ — دلِ گداختہ کے میکدے میں ساغر کھینچ

○ ... ۱۸۲۱ء

حُسن، غمزے کی کشاکش سے چُھٹا میرے بعد م بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد
منصبِ شیفتگی کے، کوئی، قابل نہ رہا م ہوئی معزولیِ انداز و ادا، میرے بعد
شمع بُجھتی ہے، تو اس میں سے دھواں اُٹھتا ہے م شعلۂ عشق سِیہ پوش ہوا، میرے بعد
خوں ہے دل خاک میں احوالِ بتاں پر، یعنی م ان کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا میرے بعد
درخورِ عرض نہیں، جوہرِ بیداد کو، جا م نگہِ ناز ہے سُرمے سے خفا میرے بعد
ہے جنوں، اہلِ جنوں کے لیے آغوشِ وداع م چاک ہوتا ہے گریباں سے جُدا، میرے بعد
کون ہوتا ہے حریفِ مَئے مرد افگنِ عشق، م ہے مکرّر لبِ ساقی میں صَلا، میرے بعد
غم سے مرتا ہوں، کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی م کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا میرے بعد
+تھی، نگہ میری نہاں خانۂ دل کی نقّاب بے خطر جیتے ہیں اربابِ ریا، میرے بعد
تھا میں گلدستۂ احباب کی بندش کی گیاہ مُتفرّق ہوے میرے رُفقا، میرے بعد
آئے ہے بیکسیِ عشق پہ رونا، غالبؔ م کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

بلا سے ہیں جو بہ پیشِ نظر در و دیوار م نگاہِ شوق کو ہیں بال و پر، در و دیوار
وفورِ اشک نے کاشانے کا کیا یہ رنگ م کہ ہو گئے مرے دیوار و در، در و دیوار
نہیں ہے سایہ، کہ سُن کر نویدِ مقدمِ یار م گئے ہیں چند قدم پیشتر، در و دیوار

+ یہ شعر پہلے پہل حاشیہ ق میں بڑھایا گیا

○ ... ۱۸۲۱ء

ہوئی ہے کس قدر ارزانیِ مئے جلوہ م کہ مست ہے ترے کوچے میں، ہر در و دیوار
جو ہے تجھے سرِ سودائے انتظار، تو آ م کہ ہیں دُکانِ متاعِ نظر، در و دیوار
ہجومِ گریہ کا سامان کب کیا میں نے؟ م کہ گر پڑے نہ مرے پانو پر، در و دیوار
وہ آ رہا مرے ہمسائے میں، تو سایے سے م ہوئے فدا در و دیوار پر، در و دیوار
نظر میں کھٹکے ہے، بن تیرے، گھر کی آبادی م ہمیشہ روتے ہیں ہم، دیکھ کر، در و دیوار
نہ پوچھ بے خودیِ عیشِ مُقدمِ سیلاب م کہ ناچتے ہیں پڑے سر بسر، در و دیوار
نہ کہہ کسی سے کہ غالبؔ نہیں زمانے میں م حریفِ رازِ محبّت، مگر، در و دیوار

لرزتا ہے مرا دل، زحمتِ مہرِ درخشاں پر م میں ہوں وہ قطرۂ شبنم کہ ہو خارِ بیاباں پر
نہ چھوڑی حضرتِ یوسفؑ نے یاں بھی خانہ آرائی م سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر
دلِ خونیں جگر بے صبر، و فیضِ عشق مستغنی! الٰہی یک قیامت خاور آ ٹوٹے بدخشاں پر
فنا تعلیمِ درسِ بے خودی ہوں اُس زمانے سے م کہ مجنوں "لام الف" لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر
فراغت کس قدر رہتی مجھے، تشویشِ مرہم سے م بہم گر صلح کرتے پارہ ہاے دل نمکداں پر
نہیں اقلیمِ الفت میں کوئی طومارِ ناز ایسا م کہ پُشتِ چشم سے جس کی، نہ ہووے مُہر عنواں پر
مجھے اب دیکھ کر ابرِ شفق آلودہ، یاد آیا! م کہ فرقت میں تری، آتش برستی تھی گلستاں پر
بجز پروازِ شوقِ ناز کیا باقی رہا ہوگا! م قیامت اک ہواے تند ہے خاکِ شہیداں پر
نہ لڑ[۱] ناصح سے، غالبؔ کیا ہوا اگر اُس نے شدّت کی م ہمارا بھی تو، آخر، زور چلتا ہے گریباں پر

---

۱ ق: ہے اسدؔ، اے بے تحمّل! عربدہ بے جا ہے ناصح سے ؛ کہ آخر بے کسوں کا زور چلتا ہے گریباں پر

○ ... ۱۸۲۱ء

حریفِ مطلبِ مشکل نہیں، فسونِ نیاز م دعا قبول ہو، یارب! کہ "عمرِ خضر دراز!"
نہ ہو، بہ ہرزہ، بیاباں نوردِ وہمِ وُجود م ہنوز تیرے تصوّر میں ہے نشیب و فراز
فریبِ صنعتِ ایجاد کا تماشا دیکھ نگاہ عکس فروش، وخیال آئنہ ساز
وصال جلوہ تماشا ہے، پر دماغ کہاں؟ م کہ دیجے آئنۂ انتظار کو پرواز
ہنوز، اے اثرِ دید، ننگِ رسوائی نگاہ فتنہ خرام، و درِ دو عالم باز
+زبس کہ جلوۂ صیّاد حیرت آرا ہے اُڑی ہے صفحۂ خاطر سے صورتِ پرواز
+ہجومِ فکر سے دل مثلِ موج لرزاں ہے کہ شیشہ نازک، وصہبا ہے آبگینہ گداز
+ہر ایک ذرّۂ عاشق ہے آفتاب پرست م گئی نہ خاک ہوئے پر، ہوائے جلوۂ ناز
+نہ پوچھ وسعتِ میخانۂ جنوں، غالبؔ م جہاں یہ کاسۂ گردوں ہے ایک خاک انداز
اسدؔ سے ترکِ وفا کا گماں وہ معنی ہے
کہ کھینچیے پرِ طائر سے صورتِ پرواز

نہ گلِ نغمہ ہوں، نہ پردۂ ساز م میں ہوں اپنی شکست کی آواز
تو اور آرائشِ خمِ کاکل[1] م میں اور اندیشہ ہائے دُور دراز
لافِ تمکیں، فریبِ سادہ دلی م ہم ہیں اور راز ہائے سینہ گداز

---

[1] ق = گیسو
+ یہ اشعار پہلی بار حاشیۂ قیا میں اضافہ کیے گئے

○ ... ۱۸۲۱ء

ہوں گرفتارِ اُلفتِ صیّاد م ورنہ باقی ہے طاقتِ پرواز
وہ بھی دن ہو! کہ اُس ستم گر سے م ناز کھینچوں، بجائے حسرتِ ناز
نہیں دل میں مرے وہ قطرۂ خوں م جس سے مژگاں ہوئی نہ ہو گُل باز
اے ترا غمزہ! یک قلم انگیز! م اے ترا ظلم! سر بسر انداز
تو ہوا جلوہ گر، مبارک ہو م ریزشِ سجدۂ جبینِ نیاز
مجُھ[1] کو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا م میں غریب اور تو غریب نواز
▭ اسد اللہ خاں تمام ہوا م اے دریغا، وہ رندِ شاہد باز!

زخم پر چھڑکیں کہاں، طفلانِ بے پروا نمک م کیا مزہ ہوتا، اگر پتھر میں بھی ہوتا نمک
گردِ راہِ یار، ہے سامانِ نازِ زخمِ دل م ورنہ ہوتا ہے جہاں میں کس قدر پیدا نمک
مجھ کو ارزانی رہے! تجھ کو مبارک ہو جیو! م نالۂ بلبل کا درد، اور خندۂ گل کا نمک
شورِ جولاں تھا کنارِ بحر پر کس کا؟ کہ آج م گردِ ساحل، ہے بہ زخمِ موجۂ دریا نمک
چھوڑ کر جانا تنِ مجروحِ عاشق حیف ہے م دل طلب کرتا ہے زخم، اور مانگے ہے اعضا نمک
داد دیتا ہے مرے زخمِ جگر کی واہ واہ! م یاد کرتا ہے مجھے، دیکھے ہے وہ جس جا نمک

---

[1] ق یہ ہے یا علی! ایک نگاہ سوئے اسد
پھر حاشیے پر اسی مصرع کو یوں لکھا ہے ؎
نگہِ التفات سوئے اسد
▭ یہ شعر قا میں بھی نہیں ہے مگر متن م میں موجود ہے

○ ... ۱۸۲۱ء

غیر کی منت نہ کھینچوں گا، پئے توفیرِ درد! م زخم مثلِ خندۂ قاتل ہے سرتاپا نمک
یاد ہیں، غالبؔ تجھے وہ دن کہ وجدِ ذوق میں م زخم سے گرتا، تو میں پلکوں سے چنتا تھا نمک
اس عمل میں عیش کی لذت نہیں ملتی اسدؔ
زورِ نسبت مَے سے رکھتا ہے نصارا کا نمک

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہوتے تک م کون جیتا ہے، تری زلف کے سر ہوتے تک؟
دامِ ہر موج میں ہے، حلقۂ صد کام نہنگ م دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہوتے تک
عاشقی صبر طلب' اور تمنا بیتاب م دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہوتے تک
تاقیامت شبِ فرقت میں گزر جائے گی عمر   سات دن ہم پہ بھی بھاری ہیں سحر ہوتے تک
ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے، لیکن م خاک ہو جائیں گے ہم، تم کو خبر ہوتے تک
پرتوِ خور سے، ہے شبنم کو فنا کی تعلیم م میں بھی ہوں، ایک عنایت کی نظر ہوتے تک
یک نظر بیش نہیں، فرصتِ ہستی، غافل م گرمیِ بزم ہے، اک رقصِ شرر ہوتے تک
غمِ ہستی کا، اسدؔ کس سے ہو، جز مرگ علاج؟ م شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہوتے تک

رہتے ہیں افسردگی سے سخت بیدردانہ، ہم   شعلہ مانندِ سمندر، بلکہ آتش خانہ، ہم

+ یہ شعر پہلے پہل حاشیہ ق میں بڑھا گیا

○ ... ۱۸۲۱ء

حسرتِ عرضِ تمنا یاں سے سمجھا چاہیے   دو جہاں حشرِ زبانِ خشک ہیں جوں شانہ، ہم
کشتیِ عالم بہ طوفانِ تغافل دے کہ ہیں   عالمِ آبِ گدازِ جوہرِ افسانہ، ہم
وحشتِ بے ربطیِ پیچ و خمِ ہستی نہ پوچھ
ننگِ بالیدن ہیں، جوں موئے سرِ دیوانہ، ہم

پاؤں میں جب وہ حنا باندھتے ہیں   میرے ہاتھوں کو جدا باندھتے ہیں
آہ کا، کس نے اثر دیکھا ہے؟ م ہم بھی ایک اپنی ہوا باندھتے ہیں
حسنِ افسردہ دلی ہا رنگیں   شوق کو پا بہ حنا باندھتے ہیں
تیرے بیمار پہ ہیں فریادی   وہ جو کاغذ میں دوا باندھتے ہیں
قید میں بھی ہے، اسیری، آزاد   چشمِ زنجیر کو وا باندھتے ہیں
شیخ جی، کعبے کا جانا معلوم   آپ مسجد میں گدھا باندھتے ہیں
کس کا دل زلف سے بھاگا؟ کہ اسدؔ
دستِ شانہ بہ قفا باندھتے ہیں

تیرے توسن کو صبا باندھتے ہیں م ہم بھی مضموں کی ہوا باندھتے ہیں
تیری فرصت کے مقابل اے عمر م برق کو پا بہ حنا باندھتے ہیں
قیدِ ہستی سے رہائی معلوم م اشک کو بے سروپا باندھتے ہیں

○ ... ۱۸۲۱ء

نشّۂ رنگ سے ہے، واشدِ گُل م مست کب بندِ قبا باندھتے ہیں
غلطی ہائے مضامیں مت پوچھ م لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں
اہلِ تدبیر کی واماندگیاں م آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں
سادہ پُرکار ہیں خوباں، غالبؔ م ہم سے پیمانِ وفا باندھتے ہیں

طاؤس نمط، داغ کے گر رنگ نکالوں یک فردِ نسب نامۂ نیرنگ نکالوں
گو تیزیِ رفتار؟ کہ صحرا سے زمیں کو جوں قمریِ بسمل، تپشِ آہنگ نکالوں
دامانِ شفق، طرفِ نقابِ مہِ نو ہے ناخن کو جگر کاوی میں بے رنگ نکالوں
کیفیتِ دیگر ہے، فشارِ دلِ خونیں! یک غنچہ سے صد خُم مَے گلرنگ نکالوں
پیمانۂ وسعت کدۂ شوق ہوں، اے رشک محفل سے مگر شمع کو دل تنگ نکالوں
گر ہو بلدِ شوق مری خاک کو وحشت صحرا کو بھی گھر سے کئی فرسنگ نکالوں

فریاد! اسدؔ، غفلتِ رسوائیِ دل سے
کس پردے میں فریاد کی آہنگ نکالوں

کیا ضعف میں اُمید کو دل تنگ نکالوں؟ میں خار ہوں، آتش میں چبھوں، رنگ نکالوں
نے کوچۂ رسوائی و زنجیرِ پریشاں کس پردے میں فریاد کی آہنگ نکالوں
یک نشو و نما جا نہیں جولانِ ہوس کو ہر چند بمقدارِ دلِ تنگ نکالوں

○ ... ۱۸۲۱ء

گر جلوۂ خُرشید خریدارِ وفا ہو جوں ذرّہ، صد آئینہ بے زنگ نکالوں
افسردۂ تمکیں ہے نَفَس گرمیِ احباب پھر شیشے سے عطرِ شررِ سنگ نکالوں
ضعف، آئنہ پردازیِ دستِ دگراں ہے تصویر کے پردے میں مگر رنگ نکالوں

ہے غیرتِ الفت کہ اسدؔ، اُس کی ادا پر
گر دیدہ و دل صلح کریں، جنگ نکالوں

بقدرِ لفظ و معنی، فکرت احرامِ گریباں ہیں وگرنہ کیجیے جو ذرّہ عریاں، ہم نمایاں ہیں
عروجِ نشّۂ واماندگی پیمانہ محمل تر برنگِ ریشۂ تاک آبلے جادے میں پنہاں ہیں
بہ وحشت گاہِ امکاں اتفاقِ چشم مشکل ہے مہ و خُرشید باہم سازِ یک خوابِ پریشاں ہیں
طلسمِ آفرینش، حلقۂ یک بزمِ ماتم ہے زمانے کے شبِ یلدا سے مُوئے سر پریشاں ہیں
یہ کس بے مہر کی تمثال کا ہے جلوہ سیمابی کہ مثلِ ذُرّہ ہائے خاک، آئینے پرافشاں ہیں
نہ انشا معنیِ مضموں، نہ املا صورتِ موزوں عنایت نامہ ہائے اہلِ دنیا، ہرزہ عُنواں ہیں
+مگر آتش ہمارا کوکبِ اقبال چمکاوے وگرنہ مثلِ خارِ خشک، مردودِ گلستاں ہیں

اسدؔ، بزمِ تماشا میں تغافل پردہ داری ہے
اگر ڈھانپے تو آنکھیں ڈھانپ، ہم تصویرِ عریاں ہیں

+ یہ شعر پہلی بار حاشیہ ق میں بڑھایا گیا

○ ... ۱۸۲۱ء

ہم سے کھل جاؤ بہ وقتِ مے پرستی ایک دن م ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن
غرّۂ اوجِ بنائے عالمِ امکاں نہ ہو م اِس بلندی کے نصیبوں میں ہے پستی ایک دن
قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں م رنگ لاوے گی ہماری فاقہ مستی ، ایک دن
نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے م بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ، ایک دن
دھول دھپّا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں م ہم ہی کر بیٹھے تھے غالبؔ پیش دستی ایک دن

رنگِ طرب ہے صورتِ عہدِ وفا گرو تھا کس قدر شکستہ کہ ہے جا بجا گرو
پروازِ نقد، دامِ تمنائے جلوہ تھا طاؤس نے اک آئنہ خانہ رکھا گرو
عرضِ بساطِ انجمنِ رنگ مفت ہے موجِ بہار رکھتی ہے اک بوریا گرو
ہر ذرّہ خاک عرضِ تمنائے رفتگاں آئینہ ہا شکستہ ، وتمثال ہا گرو
ہے تاک میں سکم ہوسِ صد قدح شراب تسبیحِ زاہداں ، بکفِ مُدّعا گرو
برقِ آبیارِ فرصتِ رنگِ دمیدہ ہوں جوں نخلِ شمع ، ریشے میں نشو و نما گرو
طاقت بساطِ دستگہِ یک قدم نہیں جوں اشک جب تلک نہ رکھوں دست و پا گرو
ہے وحشتِ جنونِ بہار اس قدر کہ ہے بالِ پری ، بہ شوخیِ موجِ صبا گرو
بے تاب سیرِ دل ہے ، سرِ ناخنِ نگار یاں نعل ہے بہ آتشِ رنگِ حنا گرو

ہوں سخت جانِ کاوشِ فکرِ سخن اسدؔ
تیشے کی ، کوہسار میں ہے یک صدا گرو

○ ... ۱۸۲۱ء

شکوہ و شکر کو ثمر بیم و امید کا سمجھ خانۂ آگہی خراب ! دل نہ سمجھ ، بلا سمجھ
ریگِ رواں و ہر تپش درسِ تسلّیِ شعاع آئنہ توڑ اے خیال جلوے کو خوں بہا سمجھ
وحشتِ دردِ بیکسی بے اثر اس قدر نہیں رشتۂ عمرِ خضر کو نالۂ نارسا سمجھ
شوقِ عناں گسل اگر درسِ جنوں ہوس کرے جادۂ سیرِ دو جہاں یک مژہ خواب پا سمجھ
گاہ بخلد امیدوار ، گہ بہ جحیم بیم ناک گرچہ خدا کی یاد ہے ، کلفتِ ماسوا سمجھ
شوخیِ حسن و عشق ہے آئنہ دارِ ہمدگر خار کو بے نیامِ جاں ، ہم کو برہنہ پا سمجھ
اے بہ سرابِ حسنِ خلق تشنۂ سعیِ امتحاں شوق کو منفعل نہ کر ، ناز کو التجا سمجھ

نغمۂ بے دِلاں ، اسدؔ ، سازِ فسانگی نہیں
بسملِ دردِ خفتہ ہوں ، گریے کو ماجرا سمجھ

کلفتِ ربطِ این و آں غفلتِ مدّعا سمجھ شوق کرے جو سر گراں محملِ خوابِ پا سمجھ
جلوہ نہیں ہے دردِ سر ، آئنہ صندلی نہ کر عکس کجا ؟ وکو نظر ؟ نقش کو مدّعا سمجھ
حیرت اگر خرام ہے ، کارِ نگہ تمام ہے گر کفِ دست بام ہے آئنے کو ہوا سمجھ
ہے خطِ عجز ما و تو ، اوّل درسِ آرزو ہے یہ سیاقِ گفتگو ، کچھ نہ سمجھ ، فنا سمجھ
شیشہ شکستِ اعتبار ، رنگ بگردش استوار گر نہ مٹیں یہ کوہسار ، آپ کو تو صدا سمجھ
نغمہ ہے محوِ سازرہ ، نشّہ ہے بے نیاز رہ رندِ تمام ناز رہ ، خلق کو پارسا سمجھ
جبر بہ پہلوئے خیال ، رزقِ دو عالم احتمال کل ہے جو وعدۂ وصال آج بھی اے خدا سمجھ

○ ... ۱۸۲۱ء

نے سر و برگِ آرزو، نے رہ و رسمِ گفتگو   اے دل و جانِ خلق، تو ہم کو آشنا سمجھ
لغزشِ پا کو ہے بلد، نغمۂ "یا علی مدد"
ٹوٹے گر آئنہ، اسدؔ، سُبحہ کو خوں بہا سمجھ

دل ہی نہیں کہ منّتِ درباں اُٹھائیے   کس کو وفا کا سلسلہ جُنباں اُٹھائیے؟
تاچند داغ بیٹھیے، نقصاں اُٹھائیے؟   اب چار سوئے عشق سے دوکاں اُٹھائیے
صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اُٹھائیے   م   طاقت کہاں کہ دید کا احساں اُٹھائیے
ہستی، فریب نامۂ موجِ سراب ہے   یک عمر نازِ شوخیِ عُنواں اُٹھائیے
ہے سنگ پر براتِ معاشِ جنونِ عشق   م   یعنی، ہنوز منّتِ طفلاں اُٹھائیے
ضبطِ جنوں سے، ہر سرِ مو ہے ترانہ خیز   یک نالہ بیٹھیے تو، نیستاں اٹھائیے
نذرِ خراشِ نالہ، سرِ شکِ نمک اثر   لطفِ کرم، بدولتِ مہماں اٹھائیے
دیوار، بارِ منّتِ مزدور سے ہے خم   م   اے خانماں خراب، نہ احساں اٹھائیے
یا میرے زخمِ رشک کو رسوا نہ کیجیے   م   یا پردۂ تبسّمِ پنہاں اٹھائیے
انگور، سعیِ بے سر و پائی سے سبز ہے
غالبؔ، بدوشِ دل خُمِ مستاں اُٹھائیے

ہے بزمِ بتاں میں سخن آزردہ لبوں سے   م   تنگ آئے ہیں ہم ایسے خوشامد طلبوں سے

○ ... ۱۸۲۱ء

ہے دورِ قدح، وجہِ پریشانیِ صہبا   م   یک بار لگا دو خُمِ مَے میرے لبوں سے
رندانِ درِ میکدہ گستاخ ہیں، زاہد   م   زنہار، نہ ہونا طرف ان بے ادبوں سے
بیدادِ وفا دیکھ، کہ جاتی رہی آخر   م   ہر چند مری جان کو تھا ربط لبوں سے
کیا پوچھے ہے برخود غلطی ہائے عزیزاں؟   خواری کو بھی اک عار ہے عالی نسبوں سے
گو تم کو رضا جوئیِ اغیار ہے لیکن   جاتی ہے ملاقات کب ایسے سببوں سے؟
مت پوچھ، اسدؔ، غصّۂ کم فرصتیِ زیست
دو دن بھی جو کاٹے، تو قیامت تعبوں سے

غمِ دنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اٹھانے کی   م   فلک کا دیکھنا، تقریب تیرے یاد آنے کی
کھلے گا کس طرح مضموں مرے مکتوب کا، یارب؟   م   قسم کھائی ہے اس کافر نے کاغذ کے جلانے کی
لپٹنا پرنیاں میں شعلۂ آتش کا آساں ہے   م   ولے مشکل ہے حکمت دل میں سوزِ غم چھپانے کی
انھیں منظور اپنے زخمیوں کا دیکھ آنا تھا   م   اٹھے تھے سیرِ گل کو، دیکھنا شوخی بہانے کی
ہماری سادگی تھی، التفاتِ ناز پر مرنا   م   ترا آنا نہ تھا ظالم، مگر تمہید جانے کی
لکد کوبِ حوادث کا تحمّل کر نہیں سکتی   م   مری طاقت کہ ضامن تھی بتوں کے ناز اٹھانے کی
کہوں کیا خوبیِ اوضاعِ ابنائے زماں، غالبؔ   م   بدی کی اس نے جس سے ہم نے کی تھی بارہا نیکی

○ ... ۱۸۲۱ء

بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی   م
سو رہتا ہے بہ اندازِ چکیدن سرنگوں، وہ بھی

رہے اس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے   م
تکلف برطرف، تھا ایک اندازِ جنوں، وہ بھی

+خیالِ مرگ کب تسکیں دلِ آزردہ کو بخشے؟   م
مرے دامِ تمنا میں ہے اک صیدِ زبوں، وہ بھی

نہ کرتا کاش! نالہ، مجھ کو کیا معلوم تھا، ہمدم   م
کہ ہوگا باعثِ افزائشِ دردِ دروں، وہ بھی

مئے عشرت کی خواہش، ساقیِ گردوں سے کیا کیجے؟   م
لیے بیٹھا ہے اک دو چار جامِ واژگوں، وہ بھی

نہ اتنا بُرّشِ تیغِ جفا پر ناز فرماؤ   م
مرے دریائے بے تابی میں ہے اک موجِ خوں وہ بھی

مجھے معلوم ہے جو تو نے میرے حق میں سوچا ہے
کہیں ہو جائے جلد، اے گردشِ گردونِ دوں، وہ بھی

+نظر راحت پہ میری، کر نہ وعدہ شب کے آنے کا
کہ میری خواب بندی کے لیے ہوگا فسوں، وہ بھی

+ یہ اشعار پہلے پہل حاشیے میں اضافہ کیے گئے

○ ... ۱۸۲۱ء

مرے دل میں ہے، غالبؔ، شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں   م
خدا وہ دن کرے، جو اُس سے میں یہ بھی کہوں، وہ بھی

سرگشتگی میں عالمِ ہستی سے یاس ہے   م   تسکیں کو دے نوید کہ مرنے کی آس ہے
لیتا نہیں مرے دلِ آوارہ کی خبر   م   اب تک وہ جانتا ہے کہ میرے ہی پاس ہے
کیجے بیاں سرورِ تبِ غم کہاں تلک؟   م   ہر مُو، مرے بدن پہ، زبانِ سپاس ہے
ہے وہ، غرورِ حسن سے بیگانۂ وفا   م   ہر چند اُس کے پاس دلِ حق شناس ہے
پی جس قدر ملے شبِ مہتاب میں شراب   م   اس بلغمی مزاج کو گرمی ہی راس ہے
کیا غم ہے اس کو، جس کا علی سا امام ہو   اتنا بھی، اے فلک زدہ، کیوں بے حواس ہے
ہر یک مکان کو ہے مکیں سے شرف، اسدؔ   م   مجنوں جو مر گیا ہے، تو جنگل اداس ہے

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے   م   خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے
کس کو سناؤں حسرتِ اظہار کا گلہ؟   م   دل، فردِ جمع و خرجِ زباں ہائے لال ہے
کس پردے میں ہے آئنہ پرداز؟ اے خدا   م   رحمت کہ عذر خواہ لبِ بے سوال ہے
ہے ہے خدا نخواستہ، وہ اور دشمنی   م   اے شوقِ منفعل، یہ تجھے کیا خیال ہے
مُشکیں، لباسِ کعبہ علی کے قدم سے جان   م   نافِ زمین ہے، نہ کہ نافِ غزال ہے
وحشت پہ میری، عرصۂ آفاق، تنگ تھا   م   دریا، زمین کو عرقِ انفعال ہے

○ ... ۱۸۲۱ء

+ہستی کے مت فریب میں آجائیو، اسدؔ م عالم تمام، حلقۂ دامِ خیال ہے
پہلوتہی نہ کر غم و اندوہ سے، اسدؔ
دل وقفِ درد رکھ کہ فقیروں کا مال ہے

رفتارِ عمر، قطعِ رہِ اضطراب ہے م اس سال کے حساب کو، برق، آفتاب ہے
مینائے مَے ہے، سرو، نشاطِ بہار سے م بالِ تدرو، جلوۂ موجِ شراب ہے
+زخمی ہوا ہے، پاشنہ پائے ثبات کا م نے بھاگنے کی گوں، نہ اقامت کی تاب ہے
+جادادِ بادہ نوشیِ رنداں ہے، شش جہت م غافل گماں کرے ہے کہ گیتی خراب ہے
نظّارہ کیا حریف ہو اس برقِ حسن کا ؟ م جوشِ بہار، جلوے کو جس کے نقاب ہے
میں نامراد دل کی تسلّی کو کیا کروں م مانا کہ تیرے رُخ سے نگہ کامیاب ہے
گزرا اسدؔ، مسرّتِ پیغامِ یار سے م قاصد پہ مجھ کو رشکِ سوال و جواب ہے

جس جا نسیم شانہ کشِ زلفِ یار ہے م نافہ، دماغِ آہوے دشتِ تتار ہے
دل مت گنوا، خبر نہ سہی، سیر ہی سہی م اے بے دماغ، آئنہ تمثال دار ہے
زنجیر یاد پڑتی ہے، جادے کو دیکھ کر اس چشم سے ہنوز نگہ یادگار ہے
بے پردہ، سوے وادیِ مجنوں گزر نہ کر م ہر ذرّے کے نقاب میں، دل بیقرار ہے

+ یہ اشعار پہلی بار حاشیہ ق میں بڑھائے گئے

○ ... ۱۸۲۱ء

سودائیِ خیال ہے، طوفانِ رنگ و بُو یاں ہے کہ داغِ لالہ، دماغِ بہار ہے
بھونچال میں گرا تھا یہ آئینہ طاق سے حیرت، شہیدِ جُنبشِ ابروے یار ہے
حیراں ہوں شوخیِ رگِ یاقوت دیکھ کر یاں ہے کہ صحبتِ خس و آتش برار ہے
اے عندلیب، یک کفِ خس بہرِ آشیاں م طوفانِ آمد آمدِ فصلِ بہار ہے
غفلت کفیلِ عمر، و اسدؔ ضامنِ نشاط
اے مرگِ ناگہاں، تجھے کیا انتظار ہے م

حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھ، اے آرزو خرامی م دل، جوشِ گریہ میں ہے ڈوبی ہوئی اسامی
کرتے ہو شکوہ کس کا ؟ تم اور بے وفائی سر پیٹتے ہیں اپنا، ہم اور نیک نامی
صد رنگ گل کترنا، در پردہ قتل کرنا تیغِ ادا نہیں ہے پابندِ بے نیامی
اُس شمع کی طرح سے جس کو کوئی بُجھا دے م میں بھی، جلے ہووں میں، ہوں داغِ ناتمامی
طرفِ سخن نہیں ہے مجھ سے، خدا نہ کردہ ہے نامہ بر کو اس سے دعواے ہم کلامی
طاقت فسانۂ باد، اندیشہ شعلہ ایجاد اے غم، ہنوز آتش، اے دل، ہنوز خامی !
ہر چند عمر گزری آزردگی میں، لیکن ہے شرحِ شوق کو بھی، جوں شکوہ، ناتمامی
ہے یاس میں اسدؔ کو ساقی سے بھی فراغت
دریا سے خشک گزری مستوں کی تشنہ کامی

٥ یہ شعر پہلے پہل متن ق میں درج ہوا

○ ... ۱۸۲۱ء

تغافل دوست ہوں، میرا دماغِ عجز عالی ہے　م　اگر پہلو تہی کیجے، تو جا میری بھی خالی ہے
بُتانِ شوخ کا دل سخت ہو گا کس قدر، یارب!　مری فریاد کو، کہسار، سازِ عجز نالی ہے
نشانِ بیقرارِ شوق، جز مژگاں، نہیں باقی　کئی کانٹے ہیں اور پیراہن شکلِ نہالی ہے
جنوں کر، اے چمن تحریر، درسِ شغلِ تنہائی　نگاہِ شوق کو، صحرا ابھی دیوانِ غزالی ہے
سیہ مستی ہے اہلِ خاک کو ابرِ بہاری سے　زمیں، جوشِ طرب سے، جامِ لبریزِ سفالی ہے
رہا آباد عالم، اہلِ ہمت کے نہ ہونے سے　م　بھرے ہیں جس قدر جام و سبو، میخانہ خالی ہے
اسدؔ، مت رکھ تعجب خرد ماغی ہائے منعم کا
کہ یہ نامرد بھی شیر افگنِ میدانِ قالی ہے

ہر قدم، دوریِ منزل ہے نمایاں مجھ سے　م　میری رفتار سے، بھاگے ہے بیاباں مجھ سے
درسِ عنوانِ تماشا، بہ تغافل خوشتر　م　ہے نگہ، رشتۂ شیرازۂ مژگاں مجھ سے
وحشتِ آتشِ دل سے، شبِ تنہائی میں　م　صورتِ دود، رہا سایہ گریزاں مجھ سے
اثرِ آبلہ سے، جادۂ صحرائے جنوں　م　صورتِ رشتۂ گوہر ہے چراغاں مجھ سے
بیخودی، بسترِ تمہیدِ فراغت ہو جو!　م　پُر ہے سائے کی طرح، میرا شبستاں مجھ سے
شوقِ دیدار میں، گر تو مجھے گردن مارے　م　ہو نگہ، مثلِ گلِ شمع، پریشاں مجھ سے
بے کسی ہائے شبِ ہجر کی وحشت، ہے ہے!　م　سایہ خورشیدِ قیامت میں ہے پنہاں مجھ سے
گردشِ ساغرِ صد جلوۂ رنگیں، تجھ سے　م　آئنہ داریِ یک دیدۂ حیراں مجھ سے

○ ... ۱۸۲۱ء

نگہِ گرم سے اک آگ ٹپکتی ہے، اسدؔ　م　ہے چراغاں، خس و خاشاکِ گلستاں مجھ سے

وحشت کہاں کہ بے خودی انشا کرے کوئی؟　ہستی کو لفظِ معنیِ عنقا کرے کوئی
لختِ جگر سے ہے، رگِ ہر خار، شاخِ گُل　م　تا چند باغبانیِ صحرا کرے کوئی
جو کچھ ہے، محوِ شوخیِ ابروئے یار ہے　آنکھوں کو رکھ کے طاق پہ دیکھا کرے کوئی
ہر سنگ و خشت، ہے صدفِ گوہرِ شکست　م　نقصاں نہیں جنوں سے جو سودا کرے کوئی
ہے وحشتِ طبیعتِ ایجاد، یاس خیز　م　یہ درد وہ نہیں کہ نہ پیدا کرے کوئی
ناکامیِ نگاہ، ہے برقِ نظارہ سوز　م　تو وہ نہیں کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی
عرضِ سرشک پر ہے، فضائے زمانہ تنگ　صحرا کہاں کہ دعوتِ دریا کرے کوئی
خوانا نہیں ہے خطِ رقمِ اضطرار کا　تدبیرِ پیچ تابِ نفس کیا کرے کوئی
وہ شوخ اپنے حسن پہ مغرور ہے، اسدؔ
دکھلا کے اس کو آئنہ توڑا کرے کوئی

جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی　م　مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی
سر بر ہوئی نہ وعدۂ صبر آزما سے عمر　م　فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی
عالم، غبارِ وحشتِ مجنوں ہے، سر بسر　م　کب تک خیالِ طرۂ لیلیٰ کرے کوئی

۵ یہ اشعار پہلی بار متن تا میں درج ہوئے

○ ... ۱۸۲۱ء

افسردگی نہیں طرب انشاے التفات م ہاں، درد بن کے دل میں مگر جا کرے کوئی
رونے سے اے ندیم، ملامت نہ کر مجھے م آخر کبھی تو عقدۂ دل وا کرے کوئی
تمثالِ جلوہ عرض کر، اے حسن کب تلک آئینۂ خیال کو دیکھا کرے کوئی
چاکِ جگر سے جب رہِ پرسش نہ وا ہوئی م کیا فائدہ کہ جیب کو رسوا کرے کوئی
بیکاریِ جنوں کو ہے سر پیٹنے کا شغل م جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی
حسنِ فروغِ شمعِ سخن دور ہے، اسدؔ م پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

جو نہ نقدِ داغِ دل کی کرے شعلہ پاسبانی م تو فسردگی نہاں ہے بہ کمینِ بے زبانی
مجھے اُس سے کیا توقع بہ زمانۂ جوانی م کبھی کودکی میں جس نے نہ سنی مری کہانی
یوں ہی دُکھ کسی کو دینا نہیں خوب ورنہ کہتا م کہ "مرے عدو کو، یارب، ملے میری زندگانی"

آ، کہ مری جان کو قرار نہیں ہے م طاقتِ بیدادِ انتظار نہیں ہے
دیتے ہیں جنت حیاتِ دہر کے بدلے م نشہ بہ اندازۂ خمار نہیں ہے
گریہ نکالے ہے تیری بزم سے مجھ کو م ہائے! کہ رونے پہ اختیار نہیں ہے
ہم سے عبث ہے، گمانِ رنجشِ خاطر م خاک میں عشاق کی غبار نہیں ہے

▭ یہ اشعار نسخۂ حمیدیہ (۱۸۲۱ء) کے ایک قصیدے کے ہیں۔ غالبؔ نے وہیں سے الگ کر کے اپنے دیوان (اشاعتِ اوّل) میں بطورِ غزل شامل کر لیے۔

○ ... ۱۸۲۱ء

دل سے اٹھا لطفِ جلوہ ہاے معانی م غیرِ گل! آئینۂ بہار نہیں ہے
قتل کا میرے کیا ہے عہد تو، بارے م وائے! اگر عہد استوار نہیں ہے
تو نے قسم میکشی کی کھائی ہے، غالبؔ؟ م تیری قسم کا کچھ اعتبار نہیں ہے

نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلّی، نہ سہی م امتحاں اور بھی باقی ہو تو یہ بھی نہ سہی
خار خارِ المِ حسرتِ دیدار تو ہے م شوق، گلچینِ گلستانِ تسلّی نہ سہی
مے پرستاں خُمِ مے منھ سے لگائے ہی بنے م ایک دن گر نہ ہوا بزم میں ساقی، نہ سہی
نفسِ قیس کہ ہے چشم و چراغِ صحرا م گر نہیں شمعِ سیہ خانۂ لیلیٰ، نہ سہی
ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق م نوحۂ غم ہی سہی، نغمۂ شادی نہ سہی
نہ ستایش کی تمنّا، نہ صلے کی پروا م گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی، نہ سہی
عشرتِ صحبتِ خوباں ہی غنیمت سمجھو م نہ ہوئی، غالبؔ، اگر عمرِ طبیعی، نہ سہی

پھونکتا ہے نالہ ہر شب صورِ اسرافیل کی ہم کو جلدی ہے، مگر تو نے قیامت ڈھیل کی
کی ہیں کس پانی سے یاں یعقوب نے آنکھیں سفید؟ ہے جو آبی پیرہن، ہر موج رودِ نیل کی
عرش پر تیرے قدم سے ہے، دماغِ گردِ رہ آج تنخواہِ شکستن ہے کُلہ جبریل کی
مدعا در پردہ، یعنی جو کہوں باطل سمجھ وہ فرنگی زادہ کھاتا ہے قسم انجیل کی
خیر خواہِ دید ہوں، از بہرِ دفعِ چشمِ زخم کھینچتا ہوں اپنی آنکھوں میں سلائی نیل کی

○ ... ۱۸۲۱ء

نالہ کھینچا ہے، سراپا داغِ جرأت ہوں اسدؔ ۔۔۔ کیا سزا ہے میرے جرمِ آرزو تاویل کی؟

کیا ہے ترکِ دنیا کاہلی سے ۔۔۔ ہمیں حاصل نہیں بے حاصلی سے
خراجِ دِیہہِ ویراں، یک کفِ خاک ۔۔۔ بیاباں خوش ہوں تیری عاملی سے
پَرافشاں ہو گئے شعلے ہزاروں ۔۔۔ رہے ہم داغ، اپنی کاہلی سے
خدا، یعنی پدر سے مہرباں تر ۔۔۔ پھرے ہم در بدر ناقابلی سے
اسدؔ قربانِ لطفِ جورِ بیدلؔ
خبر لیتے ہیں لیکن بیدلی سے

ربطِ تمیزِ اعیاں، دُردِ مئے صدا ہے ۔۔۔ اعمیٰ کو سرمۂ چشم، آوازِ آشنا، ہے
موئے دماغِ وحشت، سررشتۂ فنا ہے ۔۔۔ شیرازۂ دو عالم، یک آہِ نارسا، ہے
دیوانگی ہے تجھ کو درسِ خرام دینا ۔۔۔ موجِ بہار، یکسر زنجیرِ نقشِ پا، ہے
پروانے سے ہو، شاید، تسکینِ شعلۂ شمع ۔۔۔ آسایشِ وفاہا، بیتابیِ جفا، ہے
اے اضطرابِ سرکش، یک سجدہ وار تمکیں ۔۔۔ میں بھی ہوں شمعِ کشتہ، گر داغ خوں بہا ہے
نے حسرتِ تسلّی، نے ذوقِ بے قراری ۔۔۔ یک درد و صد دوا ہے یک دستِ صد دعا ہے
دریائے مَے ہے ساقی، لیکن خمار باقی ۔۔۔ تاکوچہ دادنِ موجِ خمیازہ آشنا ہے
وحشت نہ کھینچ، قاتل، حیرت نفس ہے بسمل ۔۔۔ جب نالہ خوں ہو، غافل، تاثیر کیا بلا ہے

○ ... ۱۸۲۱ء

بت خانے میں اسدؔ بھی بندہ تھا گاہ گاہے ۔۔۔ حضرت چلے حرم کو، اب آپ کا خدا ہے

گر یاس سر نہ کھینچے، تنگی عجب فضا ہے ۔۔۔ وسعت گہِ تمنّا، یک بام و صد ہوا ہے
برہم زنِ دو عالم، تکلیفِ یک صدا، ہے ۔۔۔ مینا شکستگاں کو کُہسار خوں بہا ہے
فکرِ سخن، یک انشا زندانیِ خموشی ۔۔۔ دودِ چراغ، گویا، زنجیرِ بے صدا ہے
موزونیِ دو عالم، قربانِ سازِ یک درد ۔۔۔ مصراعِ نالۂ نے سکتہ ہزار جا ہے
درسِ خرام تا کے خمیازۂ روانی؟ ۔۔۔ اس موجِ مَے کو، غافل، پیمانہ نقشِ پا ہے
گردش میں لا، تجلّی، صد ساغرِ تسلّی! ۔۔۔ چشمِ تحیّر آغوش، مخمورِ سرادا ہے
یک برگِ بے نوائی، صد دعوتِ نیستاں ۔۔۔ طوفانِ نالۂ دل، تا موجِ بوریا ہے
اے غنچۂ تمنّا، یعنی کفِ نگاریں ۔۔۔ دل دے، تو ہم بتا دیں مٹھی میں تیری کیا ہے
ہر نالۂ اسدؔ ہے مضمونِ داد خواہی
یعنی، سخن کو کاغذ احرامِ مدّعا ہے

ذوقِ خود داری، خرابِ وحشتِ تسخیر ہے ۔۔۔ آئنہ خانہ، مری تمثال کو، زنجیر ہے
ذرّہ دے مجنوں کے کس کس داغ کو پردازِ عرض؟ ۔۔۔ ہر بیاباں، یک بیاباں حسرتِ تعمیر ہے
میکشِ مضموں کو حسنِ ربطِ خط کیا چاہیے؟ ۔۔۔ لغزشِ رفتارِ خامہ مستیِ تحریر ہے
خانمانِ جبریانِ غافل از معنی خراب! ۔۔۔ جب ہوئے ہم بے گنہ، رحمت کی کیا تقصیر ہے؟

○ ... ۱۸۲۱ء

چاہے گر جنّت، جز آدم وارثِ آدم نہیں   شوخیِ ایمانِ زاہد، سُستیِ تدبیر ہے
شب دراز و آتشِ دل تیز، یعنی مثلِ شمع!   مہ، زسرتا ناخنِ پا، رزقِ یک شبگیر ہے
آپ ہو جلتے ہیں، ننگِ ہمتِ باطل ہے مرد
اشک پیدا کر، اسدؔ، گر آہ بے تاثیر ہے

رُباعیات

دل، سوزِ جنوں سے جلوہ منظر ہے آج   نیرنگِ زمانہ، فتنہ پرور ہے آج
یک تارِ نَفَس میں، جوں طنابِ صبّاغ   ہر پارۂ دل، بہ رنگِ دیگر ہے آج

مشکل ہے، زبس، کلام میرا، اے دل   سُن سُن کے اُسے سخنورانِ کامل
آساں کہنے کی، کرتے ہیں فرمائش   ۲   ”گویم مشکل، وگرنہ گویم مشکل“

اِضافہ آخرِ نُسخۂ حمیدیہ

۱۸۲۲ء

تا

۱۸۲۶ء

مُتفرق

نسخۂ شیرانی

۱۸۲۶ء